کشت زر بار

پروفیسر احمد رفیق اختر

کشتِ زرِبار

پروفیسر احمد رفیق اختر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

297.4 Ahmad Rafiq Akhtar, Prof.
Kisht-i Zarbar/ Prof. Ahmad Rafiq Akhtar.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2007.
127pp.
1. Islam - Sufism. I. Title.

2007
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1132-8

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

فہرست

پیش لفظ

علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عطا ہونے والا وہ عظیم عطیہ ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ اور جب علم کو عرفان پروردگار کی منزل سے آشنا کر کے علم لاہوتی بنا دیا جائے تو یہ معراج انسانیت کے حصول کی موثر اور نتیجہ خیز سبیل قرار پاتا ہے۔ اسلام دنیا کی تمام تہذیبوں' مذاہب اور نظام ہائے زندگی میں اس لحاظ سے امتیازی مقام کا حامل ہے کہ اس کا نقطۂ آغاز علم ہی ہے۔ "کشت زر بار" میں پروفیسر احمد رفیق اختر کی علم اور مقصود علم پر گفتگو اپنی معنویت اور ندرت کے حوالے سے بے مثال ہے۔ یہاں لفظ خود بولتے اور معانی لب کھولتے محسوس ہوتے ہیں۔ قرآنیات کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر وہ فکری تازگی جو ذہن جدید کی تشفی کا سامان ثابت ہو' خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پروفیسر صاحب کے ہاں عصری افکار اور مسائل کے تناظر میں قرآنی حقائق کا بیان جدا رنگ رکھتا ہے۔ "خدا اور کائنات" میں تسخیر کائنات کے حوالے سے جدید سائنس کی تحقیقات کا قرآنی تعلیمات کی روشنی میں تجزیہ قرآنی حقائق و معارف کے نئے پہلوؤں کے بیان کے ساتھ ہمارے ایمانی' اعتقادی اور علمی سرمائے پر یقین افروزی کا سامان بھی ہے۔ اسی طرح "اسلام اور عصر حاضر" میں جس طرح پروفیسر صاحب نے اسلام کے امتداد زمانہ کے اثرات سے وراء ہونے اور ہر دور میں دین مکمل ہونے کو بیان کیا ہے' اس سے مغرب کی مرعوبیت کے تارہائے عنکبوت شکستگی سے دوچار ہوتے نظر آتے ہیں۔

خداشناسی' جس کے تصور کو پروفیسر صاحب نے "ترجیح اولیٰ" میں واضح کیا ہے' کائنات کے کامل و اکمل خداشناس حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور سے طلب ہدایت کے بغیر ممکن نہیں۔ آپ ﷺ کی عظمت' رب کائنات کے حضور آپ ﷺ کے مقام و مرتبہ اور کائنات ارض و سماء میں آپؐ کے پیکر جمال کی عدیم المثلیت کو

پروفیسر صاحب نے ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' اور ''نظریہ جمال پروردگار'' میں بیان کیا ہے۔ جو قارئین کے قلوب میں عشق و محبت رسولؐ کے شعلہ ہائے جوالہ پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ یہی جذبہ عشق و مستی اور تعلق نبویؐ فلاح ابدی کا ضامن اور روح دین و ایمان ہے:

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی' تمام بولہبی است!

''کشت زربار'' اہل علم اور اصحاب ذوق کے لیے بیش بہا سرمایہ کی امین ہے' جس کی تاثیر ہمارے علمی و فکری ورثے میں عرصے تک محسوس کی جاتی رہے گی۔

طاہر حمید تنولی
۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ
۱۳ دسمبر ۱۹۹۹ء
لاہور

خطبہ اول

ترجیح اولیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا O (۸۰:۱۷)

مذہبی فکر اپنی منزل سے کس طرح ہٹی اور اس میں فکری و عملی لحاظ سے کس طرح انحطاط آیا' میں اسے ایک ایسے وقت سے شروع کر رہا ہوں جب سلطان سلیمان ذیشان کی افواج یورپ کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں۔ یوگوسلاویہ' البانیہ اور بوسنیا ترک شہسواروں کی تگ و تاز کی زد میں تھے۔ اتنا بڑا بادشاہ کہ تاریخ میں آج بھی اسے سلطان سلیمان ذیشان (The Magnificient) کے نام سے جانا جاتا ہے اور ادھر ایک ایشیا کوچک میں نہیں' وہ یورپ کے دروازوں پر بھی دستک دے رہے تھے۔ مزید یہ کہ اس زمانے میں پندرہویں اور سولہویں صدی میں دوسری طرف بھی اگر دنیا میں کسی شہنشاہ کا سکہ چلتا تھا تو وہ مسلمان ہی تھے۔ سلطان عباس صفوی جسے عباس اعظم بھی کہا جاتا تھا' ہندوستان میں جلال الدین محمد اکبر جسے اکبر اعظم کہا جاتا تھا ایک ایسے زمانے میں جبکہ قوت و شوکت اور سطوت اسلامیہ اپنے انتہا درجے پر تھی کہ دنیا میں اگر تین بڑے بادشاہ تھے تو تینوں مسلمان تھے۔ عین اس وقت پورے یورپ پر ایک ایسا زمانہ تھا جسے متفق علیہ دور تاریک (Dark Age) کہتے تھے۔ بحیرۂ روم (Mediteranean) کو ترکوں نے بند کیا ہوا تھا۔ دنیا میں ترقی اور کاروبار کا واحد راستہ بحیرۂ روم تھا جو امیر خیر الدین باربروسا کی زد میں تھا۔ اس کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ جب اس وقت یورپ کی مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی تھیں تو وہ کہتی تھیں:

"Hush the Turks are coming!"

"کہ بچو' خاموش ہو جاؤ ورنہ ترک آجائیں گے۔"

جب سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو ایک بہت بڑی تبدیلی (Shift) وقوع پذیر ہوئی۔ مذہبی فکر میں بنیادی انحطاط کا آغاز فتح سے ہی ہوا۔ جب فتح و نصرت کے علم بلند ہوئے اور مسلمانوں نے بہت زیادہ معاشرتی' اخلاقی اور عملی عروج حاصل کیا تو انہوں نے مملکت اسلامیہ کو بہت دور تک پہنچا دیا۔ اس فتح کے ساتھ ہی مسلمانوں پر تکبرات کی دبیز تہہ کی چادر چھا گئی اور وہ قومی رویوں میں غیر محتاط (Careless) ہو گئے۔ اگرچہ فتح بڑی اچھی چیز ہے' مگر فتح کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ انسان اس کی پائیداری کے احساس میں اس کے تحفظ کے سلسلے میں Relax ہو جاتا ہے اور تفاخرات میں ڈوب جاتا ہے۔ یہی المیہ ہندوستان میں ہوا' اسی طرح ایران اور سلطنت عثمانیہ اس المیے سے گزرے۔

قطعی طور پر مسلمانوں کے انحطاط کا آغاز سلطنت عثمانیہ کے زوال سے شروع ہوا' مگر یہ زوال ہتھیاروں سے نہیں ہوا۔ فتح قسطنطنیہ کے وقت اہل یورپ کا یہ حال تھا کہ جب کسی کے سر میں درد ہوتا تو وہ کسی پادری کے پاس جاتا اور پادری اسے بتاتا کہ اس کے سر میں شیطان گھس گیا ہے۔ اور پھر اس شیطانی دخل اندازی کا واحد علاج یہ ہوتا تھا کہ اس کے سر پر بڑے بڑے ڈنڈے مارے جاتے اور اس طرح مرض کا باعث شیطان مریض کے ساتھ ہی مر جاتا اور سر درد رہنے کی گنجائش بھی ختم ہو جاتی۔ اس وقت عیسائیت کی تبلیغ کرنے والے پادری عوام میں سند نجات (Certificate of Redemption) بھی تقسیم کیا کرتے تھے اور لوگوں کو کہا جاتا تھا کہ اگر تم نے جنت میں جانا ہے تو پانچ پاؤنڈ اور اگر درجات جنت میں بلندی چاہیے تو دس پاؤنڈ اور اگر اعلیٰ ترین جنت میں جانا ہے تو بیس پاؤنڈ ادا کریں۔ اس نوعیت کے سرٹیفکیٹ پادری جاری کرتے تھے۔ اس کے بالمقابل آج اس جدید زمانے میں بھی پاکستان میں ایک مولوی صاحب نے اپنے ایک شاگرد سے کہا کہ اگر آپ کھل کر فلاں جماعت کو چندہ دیں تو آپ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو وہ برخوردار اسی طرح پریشان حال مجھ تک آ گیا۔ اس نے کہا پروفیسر صاحب یہ بات میں نے سنی ہے کیا یہ سچ ہو سکتا ہے؟ میں نے اسے کہا کہ کاغذ اور پنسل لے جاؤ اور اس مولوی صاحب سے کہو کہ آپ جنت کی تصدیق لکھ دیں' مگر اس مولوی صاحب سے یہ نہ ہو سکا!

احساس فتح کا ایک ناقص ترین نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں علم کی طلب' ذوق' تحقیق اور علم کی جستجو ختم ہو گئی۔ یہ ایک عمومی اطمینان (General Satisfaction) کی

کیفیت تھی جو عالم اسلام پر چھا گئی۔ جہاں ابن سینا، حجتہ الاسلام امام محمد بن احمد الغزالی اور ابنِ رشد جیسے محقق پیدا ہوتے تھے وہاں اب علم و تعلیم اتنے خسارے میں چلی گئی کہ ایک طویل عرصے تک عالم اسلام میں فلسفہ، علم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہمیں کوئی نمایاں فرد نظر نہیں آتا۔ یہ ایک بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ فتح نے ایک General Mental Shift پیدا کردی۔ تفاخرات میں ڈوب کر ملت اسلامیہ اس بنیادی عنصر فتح سے محروم ہوگئی ہے ہم علم و جستجو کہتے ہیں۔ قوموں کا عروج وزوال تحصیل علم اور تحقیق و جستجو سے مرتب ہوتے ہیں۔ جب عالم اسلام سے علم رخصت ہونا شروع ہوا تو علم یہاں سے Transfer بھی ہونے لگا۔ عین اس وقت علم کی رو فارابی و ابن رشد یعنی کارڈووا سے لندن یونیورسٹی تک آ گئی۔ کیمبرج اور آکسفورڈ تک آ گئی۔ یورپ میں نئی تخلیقات نے جنم لیا جنہیں ہم Renaissance اور Reformation کہتے ہیں۔ تحریک احیائے مذہب اور تحریک احیائے علوم شروع ہوئی، یعنی ہم نے علم کو کھونا اور مغرب نے علم حاصل کرنا شروع کردیا۔ تحریک احیائے علوم کے بڑے بڑے سکالرز نے جو کچھ بھی پیش کیا وہ مسلمانوں سے ہی لیا ہوا تھا۔ آج بھی ماڈرن سائیکالوجی کے بانی کی کتابیں پڑھیں تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوتا ہے کہ اس نے غزالی کی کتابیں اپنے نام سے شامل کردی ہیں۔ ڈیکارٹ (Descartes 1596-1650) نے اپنی کتب میں یہ سب کچھ یہ سوچے بغیر شامل کردیا کہ کسی اور کے کام کو میں اپنے نام کے ساتھ منسوب کررہا ہوں۔

اس طرح اس دور زوال کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ ملت اسلامیہ زوال پذیر ہوتی گئی، مگر ان کی علمی جرأتوں اور افکار کی تازگی نے اہل مغرب کو ترقی کی طرف گامزن کرنا شروع کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں سے ان کی عسکری، سیاسی اور علمی و تحقیقی حاکمیت چھن گئی۔ یورپ کی آگاہی نے اسے تینوں سے آگے بڑھاتے ہوئے مسلمانوں کو پس پشت ڈال دیا اور جہاں جہاں بھی متقابل صورت حال پیش آئی۔ سیاسی، ادبی یا فلسفیانہ تحقیق میں مسلمان مغربی تحقیقات کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہ تھے اور اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ اس دوران کوئی بڑا Mystic ٹیچر پیدا نہیں ہوا۔ اسلام میں Survival کی بڑی صورت جو رہی یہ تھی کہ اسلام میں بڑی خطرناک صورت حال پیش آئی تو کوئی بڑا صوفی استاد آیا اور اس نے موجودہ صورت حال کو Revision دیا، اس طرح از سرِ نو پورے اسلام کی ہی سادگی اور عظمت برقرار رہی۔ اس نے امت مسلمہ پر اپنے ذہنی اور اخلاقی اثرات

چھوڑے۔ جب سپین میں مسلمانوں کی حکومت تباہی کے کنارے پہنچ گئی تو غزالی کے شاگرد الیعقوب المومن نے المواحدین کی تحریک کا آغاز کیا اور دو سو سال کے لیے سپین میں پھر اسلام قائم ہو گیا۔ المواحدین کے بعد المرابطین جو یوسف بن تاشفین کی تحریک تھی ان دونوں نے اس علمی Source سے حیات پا کر اس عالم زمانہ کی ہیبت کا شرف حاصل کر لیا اور ایک نئی تازگی مذہبی ماحول نے بخشی۔ اور وہ اس قابل بنے کہ اسلام کو شکست کے بحران سے نکال لیں۔ جب بغداد میں خلفاء مکمل تباہی اور مکمل اضمحلال کا شکار ہو گئے تو قدرت نے بغداد ہی سے شیخ عبدالقادر جیلانی کو پیدا کیا۔ اور ان کی وجہ سے انحطاط زمانہ رکا۔ جب مسلمان اپنی حقیقی روح مذہب کی طرف واپس لوٹے تو انہوں نے اس زوال کو دو سو سال تک تھامے رکھا۔ ہندوستان میں سلطان آف الغزنہ جہاں فتوحات کی ایک بارات لے کر آیا وہاں وہ علم کی بھی ایک سوغات لے کر آیا اور یہ سیدنا علی بن عثمان ہجویری تھے جن کے وجود مسعود نے علم معرفت کی ایک ایسی شمع روشن کی جسے بعد میں چشتیہ اصحاب نے اٹھایا۔ محبتوں سے' اخلاق سے' نرمی سے اور مروت و حسن عالم گیر سے اور اس وقت سے لے کر ایک طویل سلسلہ اللہ کی دین کی طرف عامتہ الناس کے رجوع کا شروع ہوا۔ خواجہ معین الدین چشتی ہوں یا خواجہ فرید الدین گنج شکر' خواجہ بختیار الدین ہوں یا خواجہ چراغ دہلوی' ان لوگوں نے محبت کے ایسے سوتے جاری رکھے کہ اہل کفر اور اہل شرک خدا کی واحدنیت کی طرف مائل ہوئے' تاہم بھگتی تحریک نے اس پر بند باندھنے کی کوشش کی۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی اسلام پہنچا اور جہاں جہاں بھی یہ اللہ کے بندے پہنچے یہ خالی عالم دین نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ ان کی مذہبی جہتوں کے ساتھ ان کے اخلاقی رتبے چلتے تھے۔ ان کی اعلیٰ ترین ذہنی صلاحیت تھی۔ یہ پورے مذہب کو بار بار اس مرکزی نقطے پر لاتے رہے جو ہمارا مرکز بحث ہے۔ تمام Mystics کا ایک رویہ رہا۔ ادھر انحطاط ملت اسلامیہ میں ان کا ایک رول رہا کہ عالموں کی طرح انہوں نے صرف اعمال کی Shift پر ہی زور نہیں دیا بلکہ اعمال کی نیات درست کرنے کے لیے ایک ذہنی جدوجہد کی' کیونکہ نیت کے بغیر عمل صرف قول و فعل ہے اور قول و فعل کی ہم آہنگی بھی منافقانہ ہو سکتی ہے۔

تصوف میں' Mystic میں' مومن' عدل میں' متقی میں اور اللہ کے نیک بندوں میں اور عام علماء میں صرف ایک فرق تھا کہ جہاں اچھے عالم قول و فکر کے تضاد کو ختم کرنے پر

زور دیتے تھے اہل خدا قول و فکر اور فعل تینوں کے تضاد کو ختم کرنے پر زور دیتے تھے۔ یہ ایک حتمی تعلیم تھی جو صوفیا نے ان مومنین کے گروہ نے دی کہ تمام افعال مذہب کی بجائے خدا کے لیے ہونے چاہئیں۔ رستے میں گم ہونے کی بجائے منزل کی طرف بڑھنا چاہیے۔ مذہب چلنے کا راستہ ہے اور منزل صرف اللہ ہے۔

شعلہ درگیر زد بر خس و خاشاک من!
مرشد رومی کہ گفت "منزل ما کبریا است"

(اقبالؒ)

اور جب آپ اپنی حتمی منزل کو پہلے متعین نہیں کریں گے بہت بڑی غلطی کا پوری امت شکار رہے گی اور یہ غلطی ہے اختلاط ترجیحات (Confusion of Priorities) کی۔ جب تک ہم اس بنیادی سوال کو حل نہیں کرتے کہ ہماری ایمان و اسلام میں ترجیح اول کیا ہے' اس وقت تک ہمیں خدا نہیں مل سکتا۔ چاہے ساری عمر طلب خداوندی میں گزار دی جائے مگر پروردگار کسی بھی صورت میں "ترجیح اول" سے نیچے اترنے کو تیار نہیں ہے۔ یہ ایک سنت اللہ ہے اور اس پر کوئی Compromise نہیں ہے۔ وہ ایک اعلیٰ ترین اور مکمل Priority ہے۔ وہ تخلیقات کے نیچے اپنے مقام سے گریزاں ہے' جس دن کوئی مسلمان اسے ذہناً ترجیح اول قرار دیتا ہے تو خدا اس کی ہمسائیگی میں اترتا ہے۔ وہ کبھی بندے سے دور نہیں ہوتا' مگر کیا عجیب بات ہے کہ جس مذہب کے چرچے ہم صبح و شام کرتے ہیں' جس مذہب کے قصیدے صبح و شام اخباروں میں رسائل میں کتابوں میں پڑھتے ہیں' جس کو ہم خدا کا دین کہتے ہیں جس کو ہم خدا کا واحد Valid مذہب قرار دیتے ہیں' کتنی بدقسمتی ایک یہ کہ یہ تمام مذہب مل کر ہمیں ایک خداشناس نہیں دے رہا۔ یہ ہمارا اجتماعی المیہ ہے۔ شاید ہم سے کہیں Approach میں غلطی ہو گئی ہے۔ اگر تمام مذہب اسلام مل کر بھی ہمیں ایک خداشناس نہیں دے رہا' ایک عبدالقادر جیلانی نہیں بخش رہا' ایک علی بن عثمان ہجویری نہیں بخش رہا تو دور حاضر میں ضرور کوئی غلطی ہو چکی ہے۔ کیوں ہم اپنی صحت خیال کو Ultimate سمجھ رہے ہیں۔ ہم اس پر کیوں نہیں سوچتے کہ کیا وجہ ہے کہ ہمیں خدا نہیں مل رہا۔ وہ خدا جو کہتا ہے کہ وہ ہماری رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے۔

ونحن اقرب الیہ من حبل الورید (۵۰:۱۶)

ترجمہ: اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔

وہ لوگ کون ہیں جنہیں پروردگار رگ جان سے بھی زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے۔ رکاوٹ کیا ہے؟

پروردگار نے فرمایا:

زین للناس حب الشهوات من النساء و البنين و القناطير المقنطرة من الذهب والفضة والخيل المسومة والانعام والحرث' ذلك متاع الحيوة الدنيا والله عنده حسن المآب O (۱۴:۳)

ترجمہ: لوگوں کے لیے عورتوں' بیٹوں' سونے چاندی کے ڈھیروں نشان کیے گئے گھوڑوں' مویشیوں اور کھیتوں کی محبت خوشنما بنا دی گئی ہے۔ یہ تو دنیا کا (عارضی) نفع ہے اور اللہ ہی کے پاس اعلیٰ اور اچھی تر منزل ہے۔"

یعنی عورتیں' بیویاں' بچے' گاڑیاں' گھوڑے منصب یہ سارے کے سارے اللہ نے حضرت انسان کے خیالات کو ان شہوات سے زینت دینے کا سبب بنا دیئے کہ تلاش حق میں اس کی خالصیت سامنے آسکے۔ اگر اس نے اللہ پر اس کی مخلوق کو ہی ترجیح دینی ہے تو اللہ ان کو نہیں مل سکتا۔ اگر انہوں نے اپنی بہترین صلاحیت عقل اور وقت مخلوق کو دینا ہے تو خالق تک رسائی ناممکن ہے۔ آج سے 70 سال قبل علامہ اقبال نے ایک بہت بڑے مسئلہ کی نشاندہی کی۔ جب یورپ اپنی جدید ترین ٹیکنالوجی کے ساتھ ہمارے سامنے آیا تو مسلمانوں میں دو Attitudes پیدا ہوئے۔ وہ دونوں مسلمانوں کے لیے صحت مند نہ تھے۔ ایک تقلید مغرب کا اور دوسرا تردید مغرب کا جنہوں نے مغرب کی تردید کی۔ انہوں نے علم کی شناخت کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یہ بالکل نہ سوچا کہ آج یورپ جس سوغات علم پر قائم ہے' وہ ہمارے آباؤ اجداد کا ہی ورثہ ہے۔ وہ اس حدیث کو بھول گئے کہ حکمت مومن کی میراث ہے' جہاں سے اس کا ذرہ ملے اٹھالو۔ انہوں نے بنیاد پرستانہ رویہ (Fundamentalist Attitude) اختیار کیا' جس کا مطلب ہے علم' اور علمی تحقیق کو قبول نہ کرنا اور غور و خوض کی روش کو ترک کر دینا' یہ رویہ دراصل یورپ سے شروع ہوا' سپین کی انکوزیشن سے شروع ہوا جب وہاں مذہبی پابندیوں کا نفاذ ہوا اور ازابیلا کی حکومت کے بعد جب مسلمانوں کو سپین سے ملک بدر کرنا تھا تو Inquisition بیٹھی اور اس نے صرف دو Choices دیئے:

Christianity or Expatriation

یا تو عیسائیت قبول کرو یا ملک چھوڑ دو۔ یہ فیصلہ اس وقت دیا گیا جب ایک متجسس فکری روح گلیلیو نے کائنات پر غور کرتے ہوئے کوپر نیکس کی مخالفت میں ایک اصول کائنات دریافت کیا اور اس فیصلہ کے خوف سے اس نے معافی نامہ پر دستخط کر دیئے کہ میں اپنے خیالات سے باز آیا۔ اگرچہ علمی طور پر وہ صحیح تھا۔ تاہم جدید Cosmology کا بانی گلیلیو کو قرار دیتے ہیں۔ یعنی بنیاد پرستانہ رویہ مغرب سے ہوا مگر آج یہ عالم اسلام میں جاری وساری ہے۔ جب پہلی مرتبہ لاؤڈ سپیکر آیا تو علماء اسلام نے اس پر شیطان ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ جب علماء دیوبند سے آلہ مکبر صوت کے جواز سے متعلق فتویٰ طلب کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ ناجائز ہے اور ثبوت کے طور پر قرآن حکیم کی آیت quote کی گئی کہ جب حضور گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی تعریف کر رہے تھے' تو بیچ میں لات و منات کے الفاظ آئے تو اہل کفر نے کہا آج ہمارا محمدؐ سے جھگڑا ختم ہو گیا۔ آج تو وہ بھی لات و منات کی بات کر رہے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا صدمہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر قرآن حکیم کی یہ آیت اتاری کہ اے پیغمبرؐ! تم سے پہلے پیغمبروں سے بھی یہ المیہ ہوا کہ جب وہ کچھ بولتے تھے تو شیطان اس میں کچھ ملا دیتا تھا۔ تو اس آیت کو بنیاد بنا کر فتویٰ جاری کر دیا گیا کہ چونکہ لاؤڈ سپیکر ایک جگہ ہوتا ہے اور آواز دوسری جگہ آتی ہے تو بیچ میں شیطان آکر کچھ ملا دیتا ہے۔

ایک چیز ہوتی ہے جسے Cult کہتے ہیں۔ بت پرستی کہتے ہیں۔ بت پرستی جسمانی طور پر کم ہوتی ہے اور ذہنی طور پر زیادہ عقل جہاں رکتی ہے۔ ایک بت پیدا ہو جاتا ہے۔ چاہے وہ تعصبات کا بت ہو چاہے وہ محبت کا بت ہو' عقل جہاں آئے گی وہاں ایک Cult ایک مندر سا بن جاتا ہے اور انسان اپنی صحت خیال کا اس قدر قائل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی نرگسیت (Narcissism) میں' لذت وجود خیال میں ڈوب کر اپنے آپ کو مکمل سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جن کے نزدیک ایک عقل کا بنیادی وظیفہ خدا تک پہنچنا ہے۔ علم و حکمت کی بنیادی اساس قرب خداوند کو سمجھنا ہے جو اپنے شوق کی منزل پروردگار عالم کو قرار دیتا ہے اور جو اس علیم و حکیم رب کی قربت کی سعی کے لیے دن رات سراپا عمل رہتا ہے۔ یہ اہل تصوف کا قاعدہ ہے۔

جب زمانے میں بہت بڑا بحران پیدا ہوا۔ Scepticism کے تحت بہت بڑے شکوک و شبہات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ یونانی فلسفہ نے ہماری مبادیات کی دھجیاں اڑا

دیں۔ اس وقت بھی Fundamentalism کے حامی علماء جواب دینے کے قابل نہیں تھے۔ تحقیق و جستجو کے میدان میں اس وقت بھی ایک ایسا گروہ اٹھا' جس نے اعلیٰ ترین تحصیل علم کی' گریک فلاسفی اور رومن افکار بھی سیکھے۔ انہوں نے غور و فکر سے علوم اسلامیہ کو نئی جہت بخشی اور ہر زمانے میں خدا کے وجود پر حجت و دلیل کو قائم کیا۔ خود پروردگار نے فرمایا:

ليهلك من هلك عن بينة ويحى من حى عن بينة (۴۲:۸)

ترجمہ: تاکہ جو بھی ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو بھی زندہ رہے وہ دلیل سے زندہ رہے۔

کیسی عجب بات ہے کہ خدا یہ کہہ رہا ہے کہ جو ہلاک ہوا وہ دلیل سے ہلاک ہوا اور جو زندہ ہوا وہ بھی دلیل سے زندہ ہوا اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اندھا اعتقاد ہی سب کچھ ہے۔ اگر ہم جستجوئے پروردگار کی راہ میں اپنے اخلاص کو جذباتی تعلق کے بغیر اور غور و فکر و تجسس کے ساتھ دیکھیں تو ہم اسے اتنی اہمیت بھی نہیں دیتے جتنی ایف اے' بی اے کے امتحان کو دیتے ہیں۔ ہم نے بغیر غور و فکر کے ایک سوغات سنبھالی ہوئی ہے' جو پچھلی نسلوں سے چلی آ رہی ہے۔ خدا اہل کفر کو ایک طعنہ دیتا ہے کہ تم اگر اپنے آباؤ اجداد کے دین پر قائم نہ ہوتے اور تھوڑا سا غور و فکر کرتے تو مجھے ضرور پہچان لیتے۔ کیا یہی بات ہمارے اوپر صادق نہیں آتی؟ آپ اللہ کو بے انصاف سمجھتے ہیں کہ جو طعنہ کافر کو دیتا ہے آپ کو نہ دے گا؟ تم جو اندھا دھند پیچھے سے آئی ہوئی بات کو قبول کر کے اندھے اعتقاد کو زندگی کی معراج بنا بیٹھے ہو' کیا یہ خدا کے ساتھ انصاف ہے؟ اس نے تو عقل و شعور کا صرف ایک مقصد بتایا ہے۔ عقل شعور کا اساس مقصد اپنے ذاتی مسائل کا حل' حکومتیں چلانا یا دوسرے دنیاوی کاروباری نہیں بلکہ یہ کہ تمہیں عقل و شعور عطا کر دیئے گئے ہیں اب چاہو تو مجھے مانو چاہو تو نہ مانو:

وقل الحق من ربكم فمن شاء فليومن ومن شاء فليكفر (۲۹:۱۸)

ترجمہ: اور کہہ دیجئے' کہ جو اللہ کی طرف سے ہے جو چاہے وہ ایمان لائے اور جو چاہے انکار کرے۔

یہ عقل و شعور تو معاملات زندگی میں ہمیں پرکھ کے آلے (Instruments of Judgement) کے طور پر عطا کیا گیا تھا۔ یوم میثاق جب سوال کیا گیا تو ہمارا جواب بھی

اسی حقیقت کا غماز تھا:

الست بربکم' قالو ابلیٰ شھدنا (۱۷۲:۷)

ترجمہ: (جب اللہ نے سوال کیا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا کیوں نہیں ہم نے اس کی گواہی دی۔

یعنی جانتے پہچانتے تو انکار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ جلوہ یزداں سامنے تھا۔ کسی نے سید ہجویری سے پوچھا کہ خدا ظاہر کیوں نہیں ہو گیا؟ کہ ایمان اور بے ایمانی کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا۔ تو جناب شیخ نے فرمایا اگر خدا ظاہر ہو جاتا تو خدا کا اقرار اور ایمان جبر ہو جاتا' مگر ایمان جبر نہیں ہے۔ تمام عقل و شعور کی عطائیگی کا واحد مقصد اس ترجیح اولیٰ کی پہچان اور اس کا صحیح یقین ہے۔ جب خدا مسلمان کی ترجیح اولیٰ (Top Priority) نہ رہا تو انحطاط کا آغاز ہوا' کیونکہ حصول پروردگار کی کوئی خواہش امت مسلمہ میں نہیں رہی یا وہ سکالرز جنہیں ہم صوفیاء کہتے ہیں وہ علماء جو جنید بغداد کی صورت میں تھے' علی بن عثمان ہجویری کی صورت میں تھے' ان کے کمال علمی کا یہ عالم ہے کہ انسان کی تفہیم (Understanding) میں انہوں نے جو جو بات کہی آج تک یورپ کا کوئی سائیکالوجسٹ یا فلاسفر یا فارڈین سکول کا کوئی مدبر اس تک پہنچ نہیں سکا جس کو علم نفس کے باب میں صوفیاء (Mystics) واضح کر گئے۔

مگر تصوف کے ساتھ بھی بڑی زیادتی ہوئی۔ کسی نے کہا کہ گریک فلاسفی کا اثر ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ خانقاہی نظام ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ انسان کے ذہن کی اسیری ہے۔ کسی نے کہا کہ گئے گزرے ادوار کا بقیہ ہے' حالانکہ دراصل طریقت شریعت کی نیت ہے' جس میں تمام شرعی اعمال بغیر نیت حصول خداوند کے کیے جائیں وہ شرع ہے' جب اعمال رضا و محبت خداوند کے لیے کیے جائیں تو وہ طریقت ہے۔ اس لیے جب امام بخاریؒ نے احادیث کو مرتب کیا' اس کے پس منظر کو بیان کیا تو ساتھ ایک بات ابتدائیہ میں کہی کہ میں باب ایمان میں سب سے پہلے حدیث نیت (انما الاعمال بالنیات) کو لایا ہوں' کیونکہ تمام اعمال فلاسفی آف ایکٹ کے بغیر بے کار محض ہیں کہ جب تک آپ کا موقف واضح نہیں عمل کی حیثیت غیر متعین رہے گی۔

یہ وہ وقت ہے کہ یورپ کے چڑھتے ہوئے فشار علمی کی وجہ سے' ابلاغ کی وجہ سے' اور اتنی زیادہ مسحور کن ایجادات کی وجہ سے آج مذہبی موضوع پر اور حصول رضائے

خداوند کے موضوع پر گفتگو کتنی مشکل ہو چکی ہے۔ بقول اکبر:

رقیبوں نے یہ رپٹ جا کر لکھوائی تھانے میں

اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!

آج فائیو سٹار ہوٹلز کے کلچر میں خدا کی بات کرنا عجیب لگتا ہے! کیونکہ ہمارے علمی انحطاط کا یہ عالم ہے کہ خدا کا ماحول جدید ماحول سے جدا ہے اور ہمارا تصور خدا دور وسطیٰ سے آگے نکلا ہی نہیں ہے۔ قرآن کی تفسیر اور قرآن کا ابلاغ دور وسطیٰ سے آگے نہیں آیا۔ کوئی تفسیر اٹھا کر دیکھ لیں رازی ہو یا ابن کثیر یا دیگر مفسرین یہی حقیقت ہر جگہ نظر آئے گی۔ میں جدید منکرین کی بات نہیں کر رہا جبکہ علمی استدلات بعض اوقات اتنے ناقص ہوتے ہیں کہ وہ خدا اور رسول ﷺ پر جو رائے دیتے ہیں وہ ان کی اپنی احمقانہ سند بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک حدیث کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ حضور گرامی مرتبت ﷺ نے فرمایا اے ابوذر! کیا تمہیں پتہ ہے کہ سورج کہاں جاتا ہے؟ فرمایا' اللہ اور اس کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ ارشاد ہوا سورج عالم بالا پر عرش بریں پر جاتا ہے پھر اسے کہا جاتا ہے تو لوٹ جا' تو پھر یہ پلٹتا ہے۔ پھر ایک دن اسے کہا جائے گا کہ تم نے پلٹنا نہیں ہے۔ اس جانب سے طلوع ہونا ہے۔ اس پر غلام جیلانی برق نے اعتراض کیا' غلام احمد پرویز نے اعتراض کیا کہ یہ حدیث خلاف واقعہ ہے کہ سورج تو کہیں نہیں جاتا تو یہ تو اپنی Ecliptical Movement میں گردش کرتا رہتا ہے! مگر انہوں نے اس پر صبر نہیں کیا کہ اگر کوئی چیز سمجھ نہیں آتی تو نقطہ علم کی تلاش کی خاطر رک جائیں۔ اپنی رائے کو Cult اور بت پرستی نہ بنائیں' کیونکہ انسان سوچتا ہے کہ اس کا علم ہی صرف آخر ہے۔ اگر وہ جلدی نہ کرتے تو وہ آج کے اس سائنسی انکشاف کو دیکھ لیتے کہ سورج مع اپنی Constellation کے بالا عرش تک جاتا ہے تو وہ مذکورہ حدیث مبارکہ پر معترض نہ ہوتے۔ اس طرح زیادہ تر جو ہمارے علماء اس دور میں پیدا ہوئے وہ بجائے علمی فکر میں اضافے کے مزید انحطاط کا باعث بنے کہ ہر آدمی کو قرب یزداں میں آگہی میسر نہ تھی۔ وہ اخلاص میسر نہ تھا' جس سے اللہ کا قرب چاہا جانا تھا اور جب انہوں نے ارد گرد بھی وہ لوگ نہ پائے جو علم و معرفت کی انتہا پر بھی ہوتے اور قلبی علوم اور انکشافات ذات کی بھی انتہا پر ہوتے تو انہوں نے ایک چیز فرض کر لی کہ تصوف یا یہ درجہ ایقان مفقود ہے اور تمام کا تمام زور عملیات پر چلا گیا' اس طرح عملیاتی (Pragmatist) مسلمان پیدا ہوئے جو حد درجہ نماز روزہ کی پابندی کے تو

قابل تھے مگر انہیں اس کے سوا کچھ نصیب نہ ہوا۔ اس خیال سے کہ امت مسلمہ کے انحطاط کا سبب اعمال میں کمی ہے۔ اس کی آرگنائزیشن میں پڑ گئے۔ انہوں نے بہترین کوشش کی کہ انجمنیں بنا کر دین کو آرگنائز کریں' مگر پچھلے ستر سال سے ایک بھی ایسی آرگنائزیشن نہیں جس نے کوئی موثر کام کیا ہو' مگر دس دس' پندرہ پندرہ سال میں تو صوفیائے اساتذہ نے چاہے وہ غزالی تھے' علی بن عثمان ہجویری تھے یا عبدالقادر جیلانی تھے' انہوں نے پوری کائنات اسلام بدل دی' مگر دوسری طرف جن لوگوں نے ستر سال عملیت کی آرگنائزیشن تعمیر کی' وہ امت مسلمہ کے انحطاط کو نہ روک سکے۔ یہ انحطاط اس لیے جاری رہا کہ پاور دین کا کبھی بھی مقصد نہیں رہا۔ دین کا واحد مقصد خدا طلبی اور خدا رسیدگی ہے۔ جب لوگوں کے دلوں سے آرزو و طلب و جستجوئے پرودگار اٹھ جائے تو تمام دین بالکل اس طرح ہے جیسے عیسائیت کے رسوم واطوار' تمام دین اپنے اپنے ایک ضابطے اور اصول پر قائم ہیں۔ ہم کسی دین کو اس لیے برا نہیں کہتے کہ گو وہ دین نہیں مگر ایک نظام ضرور ہیں۔ وہ تبت کا لاما ہو یا صیہونیت کا فری میسنری یا افریقہ کے شامان ہوں۔ اگرچہ یہ بھی مذاہب ہیں مگر اسلام ان سب سے جدا اور امتیازی شان کا حامل ہے۔ اگر سارے مذاہب کا مقصد جیسا کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا ہے تو ان کی راہ کو اپنانا موثر کیوں نہیں؟

میں کیوں عیسائیت یا یہودیت قبول نہیں کرتا؟

میں بدھ مت کا پیروکار کیوں نہیں بن جاتا؟

میں ہلایان یا ماہجان آرڈر کو کیوں اختیار نہیں کر لیتا؟

دنیا میں بڑے بڑے افکار اور فلسفے موجود ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ ان کا تفکر و خیال بنیادی طور پر خدا کی طرف جاتا ہے مگر عملاً وہ خدا طلبی میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اسلام ہر اس اہل دل کی مجبوری ہے جو اللہ کا طالب ہے۔ اگر کسی اور مذہب سے بھی خدا ملتا ہو تو اسلام ضروری نہیں رہتا' جس کو خدا چاہیے اسے ہر صورت میں مسلمان ہونا پڑے گا۔ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ چاہے آج ایک ارب مسلمان عملاً خدا تک نہیں پہنچ پا رہے' مگر جسے خدا کی طلب ہے اسے ہر قیمت پر اسلام قبول کرنا پڑے گا۔

تبت کا لاما پچیس برس کی ریاضت کے بعد مسلمان ہو گیا۔ بھگد یشو آرڈر اس کی نگرانی کرتا تھا۔ جب اسے کہا گیا کہ اس نے اپنا مذہب کیوں تبدیل کیا ہے؟ تو اس نے کہا کہ مجھے تسکین قلبی اور خدا کی طلب ہے جو پچیس سال تک لاما ہونے کے باوجود میں حاصل نہیں

کر سکا۔ اس لیے میں مسلمان ہو گیا۔ اسے کہا گیا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو' دراصل بطور لاما تمہاری توانائیاں ختم ہو گئی ہیں' اس لیے اب تم نے اسلام قبول کیا ہے۔ جب اس جھگڑے نے طول پکڑا تو ہانگ کانگ میں ایک بہت بڑا مناظرہ ترتیب دیا گیا جس میں اس لاما کو چیلنج کیا گیا۔ ریکارڈنگ کے لیے بہت سارے کیمرے اور ٹیلی ویژن بھی نصب کیے گئے۔ اس سے وہاں پوچھا گیا کہ تم نے اسلام قبول کر کے بغاوت کیوں کی؟ اور لاما کے آرڈر کو کیوں ترک کیا؟ تو اس نے کہا بھائیو! میں نے تمہیں پہلے بھی کہا کہ میں پچیس سال تک لاما رہا ہوں' میں نے انتہائی گہری ریاضت کی ہے' مگر اس آرڈر سے مجھے امن اور خدا نہیں ملا۔ اس لیے میں نے اسلام قبول کیا اور ان دونوں کو پا لیا۔ جب اسے کہا گیا کہ تم اپنی طاقت کھو چکے ہو تو اس نے بڑے لامے سے کہا کہ سٹیج پر آجاؤ اور میری طاقت کو آزما لو۔ جب وہ سٹیج پر آیا تو اس نے کہا اگر تم طاقتور ہو تو یہاں سے نیچے چھلانگ لگا دو۔ جب بڑا لاما سٹیج سے اترنے لگا تو ایک سناٹا چھا گیا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو بڑے لامے کا آدھا پاؤں بالکل ساکت ہو گیا اور وہ بالکل سٹیچو کی طرح لٹک گیا۔ وہاں پر تقریباً ساری دنیا کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر ہاتھ سیدھا کیا تو وہ نیچے گر گیا۔ اس پر اسلام قبول کرنے والے لامے نے کہا' بہنو اور بھائیو! میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میری طاقتیں ہرگز ختم نہیں ہوئیں' مگر 25 سال تک لاما رہنے کے باوجود مجھے امن اور خدا نہیں ملا اور سکون و خدا کو پانے کا واحد راستہ اسلام ہے۔ سو میں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ نعمت ہم میں موجود ہے' مگر ہم اس نعمت کو ضائع کر رہے ہیں۔ ہم اپنے غور و فکر کو معطل کر کے' سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے عاری ہو کر جب ہم خدا کو مکمل طور پر نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں تو ہم اللہ کی اس عظیم نعمت کی توہین کر رہے ہوتے ہیں۔

جب اصحاب رسول ﷺ میں سے ایک نے گندی سڑی ہوئی کھجوریں مسجد نبویؐ پر لٹکائیں۔ رسم یہ تھی کہ جس کا کچھ زیادہ ہوتا وہ خوراک مسجد نبویؐ پر رکھ دیتا اور وہ اصحاب جو رزق و اسباب کی سبیل نہیں رکھتے تھے وہ وہاں سے اٹھا لیتے تھے۔ ایک صحابی نے جب کچھ گلی سڑی کھجوریں وہاں رکھ دیں تو پروردگار عالم کو اتنا غصہ آیا کہ فرمایا کہ اگر تم اپنی بہترین چیز مجھ کو نہیں دے سکے تو بدترین نہ دو' درمیانی دے دو۔ مقام فکر ہے کہ اگر ہم اپنے اللہ کو بہترین عمر نہیں دے سکے تو کم از کم بدترین عمر تو نہ دیں۔ جب سماعت نہ رہی' جب بصارت نہ رہی' جب زندگی کے تمام لذات ترک ہو گئے اور اس مجبوری میں جب دنیا نے ہم کو ریٹائر

کر دیا' بہترین صلاحیتیں ہم نے دنیا کو دے دیں اور پھر دنیا نے ہمیں ایک دن کہا کہ اب اسے ینگ بلڈ کی ضرورت ہے۔ اب آپ گھر جایئے 'اللہ اللہ کیجئے' آپ ریٹائر ہوئے۔ جب یہ نوبت آئے کہ اب کوئی راستہ نہیں رہا' اس بڑھاپے میں اس نوبت کی عمر میں جسے پروردگار ارذل عمر کہتا ہے ہم پروردگار کی طرف لوٹتے ہیں:

ومنکم من یردالی ارذل العمر لکیلا یعلم بعد علم شیاء (۱۶:۷۰)' (۲۲:۵)

ترجمہ: اور تم میں سے کچھ وہ ہیں جو عمر کے برے دور کی طرف لائے جاتے ہیں کہ علم کے بعد بھی انہیں کچھ علم نہیں رہتا۔

اس سے بڑا تضاد اور کیا ہوگا کہ جو بہترین صلاحیتوں کا وقت تھا' جب ہمیں پروردگار عالم کے لیے خلوص و محبت سے جدوجہد کرنی چاہیے تھی تب ہم نے طاقت' تمام قوت' تمام شعور ایک چھوٹے مقصد کو دے دیا اور جب ہم بے کار محض ہو گئے' جب ہماری زندگی میں Protracted Cells کے کچھ نہیں رہا' جب دنیا نے ہمیں اپنے پاس سے فارغ کر دیا' اب ہم چلے ہیں' کائنات کے خالق کی تحقیق کے لیے! یہ علمی فکر کے بنیادی انحطاط کے باعث ہے کہ ہم نے خدا کو کبھی سنجیدہ نہیں لیا' حالانکہ خدا زندگی میں ترجیح اول سے نیچے آنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ اعمال میں نہیں ذہن میں ہے۔ یہ آپ کے تجسس فکری کا نچوڑ ہونا چاہیے اور یہ بات بھی یاد رکھ لیجئے کہ تمام علیت اور تمام ذہنی فکر کا صرف ایک فطری نتیجہ ہے اور وہ اللہ ہے۔ اگر آپ غور و فکر کے باوجود تخلیق اور جستجو کے باوجود آپ اللہ تک نہیں پہنچ سکے تو واپس مڑ کر دیکھئے کہ آپ کا علم کہاں غلط ہے؟ آپ کی فکر کہاں غلط ہے؟ یہ ایک قدرتی انجام ہے کہ غور و فکر فکر اللہ کے سوا کہیں اور نہیں پہنچتا۔ وگرنہ علم کا ارتقاء رک جائے گا۔ کوئی علم رسل پر آ کر رک جائے گا تو کوئی Willgenstien پر کوئی سگمنڈ فرائیڈ پر آ کر رک جائے گا۔ یہ علم تو بڑا مختصر ہے' جسے آ کر تھوڑا سا بھی وقف دیا جائے تو ختم کیا جا سکتا ہے۔ چند بڑے نام' چند بڑی تحریریں' کوانٹم کی تھیوری' نظریہ اضافیت' Gestalt کا سکول اور Behaviourism اس کے علاوہ علم جدید کیا ہے؟ یہ علم اتنا زیادہ نہیں۔ مدتیں گزریں انسان نے تحقیق و جستجو میں اتنی تیزی سے ترقی نہیں کی۔ آئن سٹائن نے اضافیت کا قانون دیا اور یہ تصور دیا کہ $E=mc^2$ یعنی توانائی اور مادے کو باہم دگر تبدیل کیا جا سکتا ہے' مگر آج تک اس کا دوسرا قانون ثابت نہیں ہو سکا۔ یعنی علم و تحقیق کی رفتار اتنی سست ہے کہ آئن سٹائن نے جو بات برسوں پہلے کہی تھی وہ آج جا کر Fusion کی صورت میں سامنے

آئی۔ انسانی ترقی کتنی محدود ہے اور کتنی سست رفتار ہے اس کا اندازہ ان ترقیوں سے کر لیں جو انسان کر رہا ہے۔

ایک بڑا کام جو علامہ اقبالؒ نے تشکیل جدید الہیات اسلامیہ میں انجام دیا وہ مذہب کا دفاع ہے۔ اس میں بھی انہوں نے اس بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آج کے مسلم فکر میں بنیادی نقص یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مغرب سے کمتر سمجھنے کے احساس میں مبتلا ہے۔ ہم میں اتنی خود اعتمادی نہیں کہ آج بھی ہم میں سے بہترین یورپ کے فکر سے مرعوب ہیں۔ آج بھی ہم اپنی عقل و ہدایت کے شعور کے لیے یورپ کی طرف دیکھتے ہیں۔ ایک طرف جو مولوی صاحب ہیں وہ اس حقیقت کو بالکل ماننے سے ہی انکاری ہیں اور دوسری طرف جو سیکولر ہیں ان کا خدا اور رسولؐ ہی یورپی فکر ہے۔ وہ اللہ اور رسولؐ کو اسی فکر سے مرتب کرتا ہے جس کو اس نے یورپی فلسفہ کی روشنی میں حاصل کیا اور ان دونوں میں بعد المشرقین ہے۔ ایک جہالت کی ابتداء اور انتہا پر ہے۔ ایک تقلید اور مغلوبیت کی انتہا پر اور کسی کو بھی آزاد فکر مسلم نہیں کہا جا سکتا۔

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

(اقبالؒ)

غلام سے لذت قرآن مت حاصل کرو چاہے حافظ قرآن ہی کیوں نہ ہو، جس ذہن پر کسی بھی مغلوبیت کا گمان ہو، مگر ناظرہ قرآن سے آگے جانے کی ہماری نوبت نہیں آتی، کیونکہ ہمارا عالم اس سے آگے کچھ دے ہی نہیں سکتا۔

آج علمی فکر میں انحطاط کیسے نہ آئے کہ قرآن حکیم کے معیار پر مسلمان پہنچ نہیں رہا۔ اللہ میں انحطاط نہیں آیا۔ اس نے تو اپنی ہدایت کا Package مکمل کر دیا ہے۔ وہ دن اس نے بتا دیا ہے کہ اے انسان تو نے اس منزل تک آنا ہے کہ سورج لپیٹ دیا جائے گا، چاند مدھم پڑ جائے گا اور ستارے بجھ جائیں گے اور ہم سورج اور چاند کو دوبارہ جمع کر دیں گے۔ بگ بینگ ختم ہو جائے گا۔ ساری کائنات تباہ ہو جائے گی۔ اے انسان تیرا یہ انجام ہے! مقام فکر ہے کہ وہ خدا جو آپ کا انجام متعین کر چکا ہے، جو آخرت کا وقت متعین کر چکا ہے، کیا اس سے بعید ہو گا کہ اس کے درمیان میں انسانی ذہن کے Intellectual Process سے ناآگاہ ہو۔ جو عرصہ حیات کو متعین کر چکا ہو جو انجام دین کو مکمل کر چکا ہو، کیسا بے خبر

انسان ہے جو ماڈرن ہو کر بھی یہ سمجھتا ہے کہ میرے Intellectual Process کی خدا کو کوئی خبر نہیں' میں جب جدید سائنسی انکشافات پر بحث کر رہا ہوں' جب میں جینیاتی انجینئرنگ کے جدید قوانین پر گفتگو کر رہا ہوں تو یہ خیال کہ شاید خدا آج کے ان جدید افکار کو نہ سمجھے گا۔ یہ آج کے انسان کی بنیادی غلطی ہے جس میں وہ مبتلا ہے۔ اس کے نزدیک خدا کا خیال جیوڈازم کے خدا کا ہے۔ یہودیت کا تصور ہے۔ وہ اسلام کے خیال کو بھی یہودی تصور خدا کے طور پر لے رہا ہے۔ اسے قطعاً اس بات کا علم نہیں کہ خدا تو بہت دور کی بات ہے وہ جن گلیکسیز کا شہنشاہ ہے' ان میں سے ایک گلیکسی کو سمجھنے میں ابھی تک انسانوں کو اس کی مدت کا اس کے فاصلے کا تعین نہیں ہو سکا۔

ایک معمولی ترین گلیکسی کی حد ابھی حضرت انسان کو پتہ نہیں لگی۔ ایک حیرت انگیز انکشاف ہبل ٹیلی اسکوپ نے کہا کہ آج سے 11.5 بلین سال قبل جو دھماکہ ہوا اور جس میں ستارے ٹکرائے تھے' اس کی روشنی اب ہبل ٹیلی اسکوپ تک پہنچی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جس گلیکسی میں ہم رہ رہے ہیں' یہ پندرہ ارب سال کی ہے۔ اگر ہم زیادہ موثر اور مضبوط ٹیلی اسکوپ بنا لیں تو ہم ابتدائے کائنات کو دیکھ سکتے ہیں۔ تخلیق و جستجو کی جو دنیا ہمارے اردگرد آباد ہو رہی ہے۔ یہ قرآن کو غلط ثابت نہیں کر رہی۔ ۱۲' ۱۳ صدی میں کسی نے ابن راہشد سے پوچھا کہ عاد و ثمود کون تھے؟ اور ان کا حشر کیا ہوا؟ ابن رشد اپنے زمانے کا سب سے بڑا فلاسفر تھا۔ وہ کسی تحقیق کے بغیر کسی چیز کو تسلیم کرنے سے عاری تھا۔ اس نے کہا عاد و ثمود کون تھے؟ تم مجھ سے ان کے حشر کی بات کرتے ہو' میں تو ان کے وجود تک سے ناآگاہ ہوں۔ یہ رویہ تھا کہ محقق بغیر تحقیق کے قرآنی آیت کو تسلیم نہیں کر رہا۔ یہ تو اب جارڈن میں Preserves نکلے۔ ان لوگوں نے جنہوں نے پہاڑوں کے اندر گھر بنائے تھے' مگر یہ آثار علما نے نہیں Archeologists نے دریافت کیے ہیں' یعنی جن حقائق کا تذکرہ قرآن کرتا ہے' جدید تحقیقات ان کا ثبوت فراہم کر رہی ہیں۔

اسی لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا قول ہے کہ تمام زمانوں کے علوم میں اس امت کا حصہ ہے۔ اگر آپ جدید علوم کی آگاہی حاصل نہ کریں گے تو آپ کی تحقیق و جستجو ناکافی رہ جائے گی۔ دو آیات میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ آپ ان پر غور کیجئے اور یہ دیکھ کر بتائیے کہ کیا یہ آیات کسی طور پر بھی آپ کو سمجھ آسکی ہیں:

کیف تکفرون باللہ و کنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ثم الیہ

ترجعون (۲۸:۲)

ترجمہ: تم اللہ کا انکار کس طرح کر سکتے ہو' حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا' پھر تمہیں موت دے گا پھر زندہ کرے گا' پھر تم اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

یہاں ایک چیلنج کے انداز میں کہا جارہا ہے کہ تم میرا انکار کس طرح کر سکتے ہو' اس کے لیے تمہارے پاس کوئی Authority نہیں ہے۔ دوسری طرف فرمایا:

اولم یر الذین کفروا ان السموات و الارض کانتا رتقا ففتقنھما (۳۰:۲۱)

ترجمہ: کیا کفر کرنے والے نہیں دیکھتے کہ آسمان اور زمین اکٹھے تھے پھر ہم نے انہیں پھاڑ کر علیحدہ کر دیا۔

یہ دونوں آیات آپ کو سمجھ نہیں آسکتیں جب تک علم ہیئت پر نظر نہ ہو۔ جب تک آپ کو بیالوجی کے علم کی جدید تحقیقات کی آگاہی نہ ہو۔ زمین کے وجود میں آنے سے متعلق ۲۷ مختلف تھیسز ہیں اور ہر تھیسز ایک بات ہی بیان کرتا ہے کہ شروع میں زمین و آسمان ایک ہی تھے پھر ایک بڑا دھماکہ ہوا اور زمین آسمان سے الگ ہو گئی۔ اسی طرح سورج اور دوسرے ستارے بھی۔ زندگی کے بارے میں کبھی کہا گیا کہ ہوا سے پیدا ہوئی' کبھی آگ سے کہا گیا کبھی اس کی ابتداء کو Spontaneous کہا گیا یعنی سائنس ایک مفروضہ قائم کرتی ہے اسے قانون کی شکل دیتی ہے اسے قانون کی شکل ایک تجربہ و مشاہدہ کی مسلسل جدوجہد کے بعد قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی کسی مفروضے کے قانون بننے کا مطلب یہ ہے کہ مدتوں کی تحقیق اور جستجو کے بعد ہم نے سائنس میں ایک باب فائنل کر دیا ہے۔ وہ قانون آج سائنس نے یہ فائنل کیا ہے کہ تمام زندگی پانی سے پیدا کی گئی ہے۔ قرآن اسے نقل نہیں کرتا بلکہ صدیوں پہلے اس حقیقت کو بیان کرتا ہے۔

وجعلنا من الماء کل شیء حی (۳۰:۲۱)

ترجمہ: اور ہم نے ہر زندہ شے کو پانی سے بنایا ہے۔

اگر آپ نے قرآن کو سمجھنا ہے تو قرآن سے پہلے جو علوم گزرے ہیں ان کی آگاہی بڑی ضروری ہے۔ یونان کا بطلیموس (Ptolimy) ہو جس نے کہا زمین کھڑی ہے اور ستارے اس کے گرد گردش کر رہے ہیں' یہ نظریہ 1500ء تک کم و بیش جاری رہا۔ اس کے بعد کوپرنیکس نے کہا کہ بطلیموس غلط تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سورج کھڑا ہے اور باقی ستارے اس کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ مگر جب ہم قرآن کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے

کہ قرآن نے ان کا ساتھ نہیں دیا بلکہ بالکل الگ بات کی:

والشمس تجری لمستقرلها ذلك تقدیر العزیز العلیم (۳۶:۳۸)

ترجمہ: اور سورج اپنے مقررہ راستے پر چل رہا ہے اور یہ اندازہ ہے غلبے والے' جاننے والے رب کا۔

وکل فی فلك یسبحون (۳۶:۴۰)

ترجمہ: اور تمام (اجرام فلکی) اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔

قرآن نے بحیثیت قانون کے بیان کیا کہ سورج' چاند' ستارے میں نے مسخر کیے' ان میں سے کوئی بھی کھڑا نہیں ہے بلکہ سب متحرک ہیں۔ 1980ء تک جنہوں نے پرانا جغرافیہ اور معلومات پڑھیں تو ہم سب یہ پڑھتے تھے کہ کچھ اجرام فلکی ساکن ہیں کچھ چل رہے ہیں۔ قرآن پڑھتے ہوئے ان لوگوں کو کتنی مشکل ہوتی ہو گی جب وہ پڑھتے ہوں گے کہ ساکن کچھ بھی نہیں سب کچھ متحرک ہے۔ یہ 80ء کی بات ہے جب بڑی بڑی دوربینیں میسر آئیں۔ ستاروں کا مطالعہ ہوا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ دنیا میں ساکن تو کچھ بھی نہیں۔ اس طرح پروردگار کی بات سچ نکلی اور تمام فلاسفی و سائنس غلط!

کیا ہمیں مطالب قرآن پاک تک پہنچنے کے لیے مطالعہ کی ضرورت نہیں' ہمیں اپنی زندگی کی بہترین جدوجہد کی ضرورت نہیں' ہمیں گہرے تفکر کی ضرورت نہیں؟ ہمیں اس محبت کی ضرورت نہیں؟ اس کی جو ہمیں پروردگار تک رسائی کا باعث بنے۔ ایک بات اچھی طرح یاد رکھئے کہ انسانی ذہنی تجسس کی ایک ہی ترجیح ہے اور وہ ترجیح اول و آخر اللہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ذہن باقی کام کیوں کرتا ہے؟ باقی کام پروٹوکول ہیں۔ اگر میں قیامت کے دن اللہ کے حضور پیش ہوں تو میری تو اس سے بے تکلفی ہے۔ مجھے وہ سوال کرے گا تو میں اسے جواب دے دوں گا کہ ساری عمر اس کے ساتھ ادھر ادھر گزاری ہے' کبھی اس سے بھاگتے ہوئے کبھی اس کے پاس جاتے ہوئے۔ تو جب وہ مجھ سے کہے گا اے میرے بندے! میں نے تجھے عقل و معرفت بخشی تھی' اپنی پہچان کے لیے اپنی شناخت کے لیے تو تو نے مجھے پہچانا کیوں نہیں؟ میں نے قبر کے ایئرپورٹ پر ایک ٹیکنیکل سوال پوچھا تھا کہ اس کے آگے جانا ہے تو ایک سوال بتا کر جاؤ ''من ربک'' تم نے صحیح جواب کیوں نہ دیا تھا۔ تو میں کہہ سکتا ہوں کہ پروردگار! تو نے مجھے فرصت ہی کب دی' اس مسئلے کو سوچنے کے لیے میں تو بیوی بچوں کی فکر میں رہا۔ مکان کی' بلڈنگ کی فکر میں رہا' سٹیٹس کی فکر میں

رہا۔ مجھے تو نے تو ایک لمحہ فرصت نہیں دی۔ میری ساری عقل تو ادھر لگ گئی۔ میں توان پر غور کرتا رہا۔ خدا کہتا ہے میرا بندہ جھوٹ کہتا ہے' ان میں سے کسی چیز کی بھی ذمہ داری اس کی نہیں تھی۔ تمام مقدر تو پروٹوکول ہے۔ اس میں سے کسی چیز کی بھی ذمہ داری آپ کی نہیں تھی۔ آپ کو جس کام کے لیے بھیجا گیا تھا وہ اس سے مختلف تھا۔ آپ کو عقل و شعور اور تجسس و فکر شناخت خداوند کریم کے لیے دیا گیا تھا' مگر آپ اسے کم ترجیح دیتے رہے! آپ نے بیوی پر توجہ لگا دی' بچوں پر توجہ لگا دی اور جب وقت چلا گیا تو آپ مسلمان تو ہیں مگر آپ اللہ کے محبوب بندے نہیں بن سکتے۔ اللہ نے آپ کو اپنی بخشش سے نوازا تو یہ کرم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے لرزتے ہوئے آنسوؤں نے آپ کی نجات کا بندوبست کر دیا' ورنہ جو نعمت اللہ نے ہمیں دی تھی ہم اس کے حق دار نہیں ہیں۔ ہم نے اسے اس کے بنیادی مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ میں اپنے بھائی کو کہتا ہوں بھائی یہ پیسے لے جاؤ پنڈی جا رہے ہو' اچھا کھاؤ پیو' اچھے ہوٹل میں ٹھہرو' لیکن میرا یہ خط وہاں پہنچا دو۔ تین دن بعد وہ میرے پاس آتا ہے کہتا ہے' بھائی صاحب میں نے بہت انجوائے کیا' بڑا اچھا وقت گزارا' میں نے دو موویز دیکھیں' فلاں ایکٹر کا تو جواب ہی نہیں تھا' میں مسجد بھی گیا' فلاں جگہ بھی گیا! میں اسے کہتا ہوں بھائی ٹھیک ہے سیر بھی کر لی اور سرمایہ بھی لگا دیا لیکن میرے خط کا کیا بنا؟ وہ کہنے لگا ''سوری سر' خط تو میں Deliver نہیں کر سکا!'' (گویا وقت نہیں ملا) اب تصور کریں کہ میرے غصے اور جھنجلاہٹ کا کیا عالم ہو گا؟

اسی طرح خدا نے ہمیں رزق دیا۔ بیوی بچے دیئے' تفریح دی' ہر چیز اس نے ہمیں عطا کر دی' مگر جو لیٹر ہم نے ڈیلیور کرنا تھا' وہ ہم نے واپس اللہ کو لوٹا دیا۔ نفسیات کا ایک اساسی نکتہ اور اصول یاد رکھیں کہ ذہنی طور پر جس چیز نے آپ کو Possess کیا مرتے دم تک وہی آپ کے ساتھ رہے گی۔ زندگی میں آپ نے جس چیز کو ترجیح دی جس کی خاطر صبح وشام اپنے تصور کے چراغ جلائے اور جس خیال کو اپنے آغوش ذہن میں پالا اور اس کی خاطر راتیں جاگیں اور صبحیں ضائع کیں' وہی آپ کے ساتھ قبر تک جائے گا۔ اس لیے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کائنات کے سب سے بڑے سائیکالوجسٹ نے آپ کو بتایا کہ اللہ سے گمان ٹھیک رکھنا خاص کر مرتے وقت! یہ گمان کیا چیز ہے؟ ایک بدو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور پوچھنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کو حساب کون

لے گا؟ فرمایا' اللہ خود! وہ ہنسا اور چل دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حیران ہوئے کہ اس میں ہنسنے کی تو کوئی بات نہیں تھی۔ فرمایا' دوڑو اور اسے واپس بلا کر لاؤ۔ جب وہ واپس آیا تو پوچھا تو ہنسا کیوں؟ اس نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے دیکھا ہے کہ جب کوئی زندگی میں اعلیٰ ظرف حساب لیتا ہے تو نرم لیتا ہے۔ اللہ سے بڑا اعلیٰ ظرف کون ہوگا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' دیکھو اس بدو کا گمان اللہ پر کتنا اچھا ہے۔ اور فرمایا کہ آخرت پہ گمان اللہ سے درست رکھنا۔

لوگ کہتے ہیں کہ تقلید اچھی نہیں ہوتی۔ بہت سارے مذہبی فکر میں ایسے لوگ پیدا ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ تقلید اچھی نہیں ہوتی' مگر اب ذہن کی استطاعت جو ہے وہ اتنی محدود ہے کہ ایک ریڑھے والے کو آپ کا دماغ دے دیا جائے تو وہ اگلے دن ہی مر جائے گا۔ اسے صبر و سکون اور بوجھ اٹھانے کی طاقت اور استطاعت اللہ نے دی ہے' جو آپ میں نہیں ہے۔ آپ کا ذہن اسے ملتے ہی وہ بے چینی اور اضطراب سے مر جائے گا' تمام اذہان کو خدا نے اس کے کام کے مطابق ترتیب دیا ہے اور جبر کی تعریف یہ نہیں کہ مقدر میں کیا لکھا ہے اور کیا نہیں لکھا' جبر کی ایک خوبصورت تعریف ایک مغربی نے Scientific Determination کا فلسفہ دیتے ہوئے یوں کی:

"A moment of time is filled into a piece of space."

اگر اللہ ایسا نہ کرتا تو ایک بحران زندگی پیدا ہو جاتا۔ زمین پر کسی کو گھر نہ ملتا۔ کسی کو شناسائی نہ ملتی۔ انسانیت کا باہم ایسا افراتفری پر مشتمل ملاپ ہوتا کہ ایک ہی جگہ سارے اکٹھے ہوتے نہ کسی کو گلی نظر آتی نہ کسی کو دروازہ نہ آج ہم یہاں ہوتے۔ تو خدا نے اس لمحہ زمانہ کو اس نظام کے ساتھ جوڑ کر آپ کو زحمت شنوائی کی اور مجھے ہفت گفتار بخشی۔ اس طرح اللہ کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس محدود رویے کو ترک کرنا ہوگا' جس پر ہم قائم ہیں۔ دیکھیں ایک لڑکا ایف ایس سی میں داخلہ لیتا ہے پھر ایم بی بی ایس کرتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ وہ پیشہ وارانہ مہارت کے کمال پر ہوتا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ زندگی میں اس نے بڑی علمی تحقیق اور جستجو کے بعد یہ مقام حاصل کیا ہے۔ ایک سادہ موٹر مکینک بھی ۲۰ سال بعد اس کا پورا علم جانتا ہے اور پھر وہ سلف کو کنجی لگا کر کہتا ہے کہ اس میں فلاں نقص ہے۔ ہر جگہ علم و حکمت ترقی کرتی ہے سوائے مسلمانوں کے ہاں! یہاں ایک شخص اسلام کو نماز اور روزے سے شروع کرتا ہے اور پھر اسی پر مرتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ دنیا کی چھوٹی

چھوٹی یونیورسٹیوں کے طالب علم تو بہت ترقی کر گئے مگر خدائے علیم و حکیم کی طرف جانے والا بالکل وہیں کھڑا ہے جہاں وہ ازل سے کھڑا تھا۔ اس میں اللہ میاں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بنیادی طور پر یہ ہماری خامی ہے کہ ہم اس مکتبہ علمیہ تک نہیں پہنچ سکے، جس پر خدا اور اس کا قرآن قائم ہے، جس پر وہ تعلیم قائم ہے۔ بنیادی طور پر دو خامیاں ہیں۔ ایک تو ہمارا مغربی فکر کے سامنے احساس کمتری ہے۔ کبھی ہم اس کا شدت سے انکار کر کے Stubborn Animals ہو جاتے ہیں اور کبھی شدت سے قبول کر کے ہم اپنا احساس ذہن کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ دونوں خامیاں ہم میں موجود ہیں اور دوسرا یہ کہ ہم سے مدت ہوئی ہماری ترجیح اول کھو گئی ہے۔ ہم اسلام مانگتے ہیں، ہم مذہب کی پرستش کر رہے ہیں، ہم خدا کی پرستش نہیں کر رہے، جب تک ہمارے اذہان میں یہ ابہام Clear نہیں ہو گا کہ ہماری سمت کا تعین ترجیح اول کی صحیح تعیناتی کے بغیر نہ ہو سکے گا، اس وقت تک ہمارا مذہب صحیح بنیاد پر استوار نہیں ہو گا۔ خدا نے تو ہم سے وعدہ کیا ہے بہت بڑا وعدہ اتنا کھلا اور کشادہ وعدہ کہ پروردگار کے اس وعدے پر اعتبار نہ کرنا عجیب سا لگتا ہے:

ولاتھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین (۱۳۹:۳)

ترجمہ: اور سستی نہ کرنا اور غم نہ کرنا اور تم ہی غالب ہو اگر تم اہل ایمان ہو۔

فرمایا سستی اور غم نہ کرنا۔ مجھے اپنے عزوجلال کی قسم ہے کہ اگر تم اہل ایمان ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔ ہم غالب کیوں نہیں؟ بڑی مدت سے نہیں، بہت صدیوں سے نہیں ہیں۔ اس کی ایک وجہ بہت سادہ سی ہے۔ ہمارے علمی فکر کے مکمل انحطاط نے ہمیں ترجیحات سے غافل کر دیا۔ ہم دین اور عمل کی بہت زیادہ باتیں کرتے ہیں، مگر دین کی غرض و غایت سے ناآگاہ ہیں۔ ہماری زندگی کی نفسیات اللہ کے احکام سے مرتب نہیں ہوتی۔ ہماری فکر پر کسی الوہی رہنمائی کا سایہ نہیں ہے۔ ہم تمام ترجیحات سے نمٹنے کے بعد بالآخر عمر آخر میں اللہ کی طرف جاتے ہیں۔ ہم اپنے علمی مسلک میں اتنے کمزور ہیں کہ ہم نے دین کی وضاحت کا کام سب سے کم تر علم والوں کو دے رکھا ہے اور ہم نے کبھی محنت نہیں کی۔ سوچا تک نہیں کہ ایک بی اے کرنے کے لیے چودہ برس گزر گئے تو اتنی بڑی کائنات کے رب کی علمی تحقیق اور جستجو کے لیے کیا ایک سال بھی نہ لگے گا۔ کیا ہم نے زندگی کا کوئی وقت بھی سنجیدگی سے خدا کو دیا ہے؟ اس سے کچھ سیکھنے کے لیے دیا ہے؟ اس کو جاننے کے لیے دیا ہے؟ یہ وہ بنیادی نقائص ہیں جو ہمارے انحطاط کا باعث ہیں۔ رب کعبہ کی قسم! اگر

آج بھی مسلمان محقق، مسلمان طالب علم خدا کو سامنے رکھتے ہوئے تعلیم حاصل کریں تو خدا شناس ہو سکتے ہیں۔ یہ بد قسمتی کی بات ہے کہ علم برائے علم نہیں رہا، علم برائے خدا تو بڑی دور کی بات ہے۔ عالم اسلام میں یہ ایک حادثہ اور المیہ ہے کہ تمام علم برائے مال حاصل کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر اس سے مال کما رہا ہے، انجینئر اس سے مال کما رہا ہے، مگر علم برائے خدا یا علم برائے علم کا وجود اٹھ گیا ہے۔ ایسا علم ہمیں کہاں لے جا سکتا ہے۔ وہ تو آپ کے دیار ذہن کا جلا وطن ہے۔ پتہ نہیں بے چارہ کہاں کھو گیا ہے اور انتظار کر رہا ہے کہ کب یہ مجھے گھر بلائے اور کب میراث مومن اپنے گھر کو پلٹے؟ کہ کب یہ رب ذوالجلال کی آیات کو پورا کرے؟ کب یہ حکمت و میراث مرد مومن کو طلب کرے؟ کب یہ خدا کے لیے خدا کو جاننا پسند کرے؟ بغیر علم کے حقیقت اشیاء نہیں ملا کرتی۔ علم کی دین میں اس سے عجیب کوئی بات نہیں جو رسل نے کہی:

"We only know the relationship of things, we do not know the nature of things."

بیسویں صدی کا علم آج اس مقام پر پہنچ رہا ہے کہ ہم صرف اشیاء کے تعلق کو جانتے ہیں اور اشیاء کی حقیقت نہیں جانتے، مگر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم اس نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ہیں جو 15 سو برس قبل دعا مانگ رہے ہیں:

اللھم ارنی حقائق الاشیاء کماھی (الحدیث)

اے اللہ مجھے اشیاء کی حقیقت ایسے دکھا جیسے کہ وہ ہے۔

آپ کا رہبر کیسا عجیب استاد ہے وہ جو انداز فکر اور علم آپ کو سکھا رہا ہے۔ وہ آپ کو بتا رہا ہے کہ جب بھی اللہ سے مانگو حقیقت اشیاء کی دعا مانگو کہ اے پروردگار مجھے حقیقت اشیاء کا علم دے۔ مجھے اس کی گہرائی فکر عطا کر دے کہ میں علم شش جہات کی تہہ تک پہنچوں۔ مجھے ایسا علم دے ایسا تجسس دے کہ میں دامن یزداں کو چاک کر کے گزروں۔ اقبال نے بڑی خوبصورت بات کہی:

جبریل زبوں صیدے در دست جنون من
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

کہ میرے جنون و عقل کے صحراء میں جبرائیل بہت ہی معمولی قیدی ہے۔ بہت ہی معمولی شکار ہے۔ میں کیوں ملائکہ کی جستجو کروں؟ اگر تم میں ہمت ہے تو کمند اللہ پر پھینکو۔

کیونکہ اسے اس سے محبت ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ اللہ نے بھی یہ بڑی بات کہی۔ اللہ تعالیٰ نے قطعی یہ کہا کہ مجھے اس طرح چاہو جس طرح محبوب کو چاہتے ہو۔ اس سے کم تر پر میں تمہیں نصیب نہیں ہو سکتا۔ ارشاد فرمایا:

فذکرو الله کذکر اباء کم او اشد ذکرا (۲:۲۰۰)

ترجمہ: پس اللہ کو ایسے یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔

مجھے اس طرح چاہو جیسے اپنے Belonging کو چاہتے ہو۔ عرب کے سب سے مضبوط تعلق آباؤاجداد سے تعلق تھے۔ تو اللہ نے کہا کہ خوف و وحشت والی بات مجھے پسند نہیں ہے۔ یہ ڈرامہ عذر چھوڑو۔ اگر تم نے مجھے یاد کرنا ہے تو بعینہ اسی طرح محبت کرو جیسے اپنے آباؤاجداد سے بھی زیادہ مجھ سے محبت رکھتے ہو۔ ایسے لگتا ہے کہ آسمانوں پر تنہائی نے اسے صرف محبت ہی سکھائی ہے۔ وہ آپ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ آپ میں سے کتنا چوائس (Choice) رکھتا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ لاکھوں کروڑوں میں سے اور ارب ہا ارب لوگوں میں سے وہ کتنوں کی ہوس رکھتا کہ حضور گرامی مرتبت نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی' جب زمین پر ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہوگا۔ دیکھئے دنیا کتنی بڑی لیبارٹری ہے' اس میں Wastage کتنی زیادہ ہے اور چانسز کتنے محدود ہیں کہ اگر چھ ارب میں سے ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہو تو اللہ قیامت برپا نہیں کریگا۔ اسے اپنے یاد کرنے والے سے محبت ہے۔ اس لیے قرآن حکیم میں یہ تعلیم دی گئی:

اتل ما اوحی الیك من الکتب (۲۹:۴۵)

ترجمہ: اے پیغمبرؐ! جو کتاب آپ کو دی گئی ہے اس کی تلاوت فرمائیں۔

تلاوت کتاب سے مراد اللہ کا ذکر ہے۔ اسے دوسرے مقام پر واضح کردیا گیا کہ قرآن حکیم دراصل اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے:

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون (۱۵:۹)

ترجمہ: بے شک ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اسی طرح دوسرے مقام پر نماز کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا:

واقم الصلوٰۃ ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر (۲۹:۴۵)

ترجمہ: اور نماز قائم کرو' بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

پھر فرمایا کہ نماز میرے ذکر کے لیے قائم کرو۔ قرآن بھی ذکر ہے۔ مگر کیا پروردگار کا منشا الٰہی اذکار تک ہے یا ذکر کا کوئی اور Pattern بھی ہے۔ فرمایا:

ولذکر اللہ اکبر (۲۹:۴۵)

ترجمہ: اور اللہ کا ذکر بہت بڑا ہے۔

کہ قرآن پڑھو، نماز ادا کرو، مگر میری یاد بہت بڑی بات ہے۔ یہ کیسی یاد ہو سکتی ہے؟ یہ یاد کوئی رسم نہیں ہے۔ یہ طریق کار کی قید نہیں ہے۔ اس کا کوئی مخصوص انداز نہیں ہے۔ یہ پگڑیاں باندھ کر نہیں کی جاتی مصلے سمیٹ کر نہیں کی جاتی، عطر لگا کر نہیں کی جاتی، یہ تو بدترین غلاظت میں اندھیروں میں، تاریکیوں میں، بدبو اور تعفن کے ماحول میں بھی ممکن ہے۔

فنادیٰ فی الظلمت ان لا الہ الا انت سبحنك انی کنت من الظلمین (۲۱:۸۷)

ذرا غور کیجئے! آج آیت کریمہ پڑھنے کے لیے کیا کیا اسباب و سامان مہیا نہیں کیے جاتے۔ خوشبوئیں، رنگ و روغن، چاندنیاں فرش دھلے ہوئے اور بڑے اہتمام سے ہر ایک دانے پر پڑھا جاتا ہے، مگر پڑھنے والے نے اسے کیسا پڑھا؟ کیا پڑھنے والے کو جواب نہیں ملا؟ کیا پڑھنے والے نے اسے جواب نہیں دیا؟ نہیں بلکہ اس آیت کریمہ کو سب سے پہلے پڑھنے والے کو جواب بھی دیا گیا اور پھر اس جواب کو ایک اصول بھی بنا دیا کہ ہم نے ایسے پڑھنے والے کو بھی نجات دی اور آیندہ کے لیے بھی یہ ضابطہ قرار فرمایا۔

فاستجبنالہ ونجینه من الغم وکذلك ننجی المومنین (۲۱:۸۸)

ترجمہ: پس ہم نے اس کی پکار کو قبول کیا اور ہم نے اسے غم سے نجات دی اور اسی طرح ہم اہل ایمان کو نجات دیتے ہیں۔

یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس آیت کریمہ میں کیا ہے؟ یہ ایک بڑی سادہ سی سٹیٹمنٹ ہے:

"Oh God! You are right, I am wrong, sorry."

سادہ سی بات ہے کہ اے پروردگار مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ مکمل تو آپ ہو کہ آپ سے غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ میرے کمپیوٹر میں تم نے پہلے ہی غلطی کی گنجائش رکھی تھی سو غلطی ہو گئی۔ میں خسارے میں چلا گیا ہوں۔ میری خطا معاف کیجئے! اس سادہ سے اعتراف پر پروردگار نے قرآن میں لکھا ہوا وعدہ دے دیا کہ: "وکذلك ننجی المومنین" کہ ہم

نے اسے غم سے نجات دی اور نہ صرف اسے بلکہ رہتی دنیا کے لیے یہ ایک اصول بن گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بھائی یونس علیہ السلام کو پہلی مرتبہ یہ اسم گرامی عطا ہوا تھا' مگر میری امت کو ویسے ہی مل جائے گا جو کلمہ عالیہ ان کی نجات کا باعث تھا' جو یونس علیہ السلام کے لیے اتنے کرب وبلا اور اذیت وابتلاء میں نجات کا باعث بنا' وہ ہمیں حضور ﷺ کے طفیل ویسے ہی عطا ہو گیا۔ فرمایا اے اہل ایمان! جب تم بھی اس انکسار اور محبت سے یہ دعا مانگو گے تو یقین جانو ہم تمہیں بھی معافی اور نجات عطا کریں گے۔ اس کے بعد کون ہے جو خدا کے وعدے پر اعتبار نہ کرے گا۔

میں اس حقیقت کو بھی واضح کرتا چلوں کہ اللہ کا تشکیل دیا ہوا سارا نظام سائنٹفک ہے۔ اللہ کے ہاں کوئی بے ترتیبی نہیں ہے۔ سپر کمپیوٹر لگا ہوا ہے' بہت بڑا کمپیوٹر اپنے کام میں مصروف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک بہت بڑا درخت ہے اور موت کے زیر اثر اس سے ایک پتہ نیچے گرتا ہے اور اس پر گئے گزرے کا نام لکھا ہوتا ہے۔ ملائکہ اسے اٹھاتے ہیں اور مرنے والے کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ صرف درخت کو کمپیوٹر میں بدل دیا۔ کارڈ باہر نکل رہے ہیں اور اٹینڈنٹ کھڑے ہیں۔ کارڈ پنچ ہو رہا ہے۔ وہ کارڈ اٹھاتے جاتے ہیں۔ معراج کی شب کے متعلق رسول گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے جبریل امینؑ لے کر ایک درخت کے پاس آئے وہ اوپر سے درخت کی طرح تھا۔ اس میں دو جگہیں بیٹھنے کی بنی تھیں ایک پہ جبریل بیٹھے اور ایک پہ مجھے بیٹھنے کا کہا' پھر اشارہ کیا۔ اس سواری سے شرارے اور آگ نکلی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پلک جھپکتے ہی وہ آفاق کو چھو گیا۔ یہاں گھوڑے کی جگہ کا سمک ہیلی کاپٹر کردیں جس پر دو سیٹیں بنی تھیں۔ جناب جبریل امین علیہ السلام نے حضور گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کو بٹھایا اور ایک اشارہ کیا اور پھر اچانک اس کا فیول نکلا اور وہ روشنی کی رفتار سے نکلتا ہوا آفاق کی حدوں سے بھی آگے نکل گیا۔ اس زمانہ میں وہ محاورہ آگے نہیں بڑھ سکتا' یعنی علوم جدیدہ کا حامل ہوتے ہوئے ہمیں مفاہیم کی تفہیم کے لیے تعبیر کرنا ہوگی۔ آج سے تقریباً ایک سال قبل میں نے ایک حدیث کا تذکرہ کیا کہ اس کی رو سے بہت جلد جینٹک انجینئر انسان کی کاپی بنالیں گے۔ تو ہر ایک نے کہا کب؟ میں نے کہا کہ سال دو سال میں بنالیں گے مگر صرف تین ماہ ہی گزرے تھے کہ کلوننگ آگئی۔ پھر پوچھا گیا کہ وہ حدیث کون سی تھی' جس سے میں نے یہ اخذ کیا؟ میں نے اسے اس حدیث سے پری گیس کیا کہ حضور گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا' دجال کے پاس ایک شخص آئے گا اور اسے کہے گا کیا تو میرا بھائی زندہ کر سکتا ہے۔ دجال کہے گا ہاں کر سکتا ہوں اور وہ اس کا بھائی زندہ کر دے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا یہ وہی شخص ہو گا؟ فرمایا نہیں بلکہ اس کی مثال ہو گا۔ خدا کا شکر ہے کہ جس لیکچر میں یہ بات بیان کی اس پر تاریخ لکھی ورنہ دانشور کہتے کہ سائنس کی دریافت ہو چکی اور پروفیسر صاحب اب بیان کر رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور حدیث ہے اگر یہ دور' یہ زمانہ اسی طرح چلتا رہا تو وہ بھی ضرور پوری ہو گی کہ انسان مردہ ہونے سے قبل تین مرتبہ موت سے دوچار ہو گا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا' دجال کے پاس ایک شخص جائے گا اور کہے گا کہ کیا تو مجھے مار کر زندہ کر سکتا ہے؟ دجال کہے گا ہاں! اسے مارے گا پھر زندہ کرے گا' پھر اسے مارے گا پھر زندہ کرے گا پھر مارے گا پھر زندہ کرے گا مگر چوتھی مرتبہ ایسا نہیں کر سکے گا۔ یہ حدیث بالکل واضح طور پر اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ طب اور جینیٹک انجینئرنگ تین مرتبہ مردہ شخص کو زندہ کرنے کی اہلیت حاصل کر لیں گے' مگر چوتھی مرتبہ وہ ایسا کرنے سے قاصر ہوں گے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی یہ عمر جسے ہم آج ۴۵' ۵۰ سال تک ہی محدود سمجھتے ہیں یہ ہماری اپنی فہم کی وجہ سے اتنی محدود ہے نہ کہ مقدرات کی وجہ سے۔ جب ہم اس درجہ تک اپنی تحقیق و جستجو کے ذریعے پہنچ جائیں جہاں یہ مدت بڑھے تو یہ حد بدل جائے گی۔ جیسے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تم ہزار سال تک جیو تو کیا پھر مرو گے نہیں؟ گویا کم از کم انسانی زندگی کا Span ایک ہزار سال کا ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص تھوڑا سا علم قرآن رکھتا ہو تو قرآن کو پڑھنے کے بعد وہ بہ آسانی محسوس کر لیتا ہے کہ قرآن بہت آگے کی بات کرتا ہے اور انسانی ترقی کو بہت پہلے سے Visualise کرتا ہے' جس طرح فرمایا کہ اے حضرت انسان! میں نے سات آسمان اور ایسی ہی سات زمینیں بنائیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان تمام افلاک و زمینوں کے درمیان میرا حکم بھی اترتا ہے:

اللہ الذی خلق سبع سموت و من الارض مثلھن یتنزل الامر بینھن لتعلموا ان اللہ علے کل شیءٍ قدیر' وان اللہ قد احاط بکل شیءٍ علماO (۶۵:۱۲)

ترجمہ: اللہ وہی ہے جس نے ساتوں آسمان اور اتنی ہی زمینیں پیدا کیں۔ ان کے درمیان اس کا امر اترتا ہے تاکہ تم جان لو کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ بے

شک اللہ نے اپنے علم سے ہر شے کا احاطہ کر رکھا ہے۔

اور امر قرآن کو کہا گیا ہے کہ ان تمام زمینوں پر میرا حکم اترتا ہے تاکہ تم جان لو کہ ہم کتنی بڑی قدرت والے ہیں۔ آیندہ آنے والے زمانوں میں چاہے Nasa ہو یا Huble وہ یقیناً دور کے Glaxial Order میں وہ Life Belts ضرور دریافت کر لیں گے جو اللہ کی اس قرآنی آیت کی تصدیق کریں گے۔ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے اور حدیث مسلم میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اس زمین کے لوگوں کا حساب ہو چکا ہوگا تو پھر بھی جنت میں جگہ خالی رہ جائے گی۔ پھر اللہ نئے لوگ پیدا کرے گا اور انہیں پھر آزمائشوں سے گزارے گا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین پہلی زمین نہیں ہے اور نہ ہی یہ آخری زمین ہے۔ یہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے' جو پروردگار کے ساتھ جاری ہے اور تخلیق کا لامتناہی پراسس ہے' مگر ہمارا تصور خدا بہت ہی محدود ہے' جس طرح ایک چھوٹی مچھلی بڑی مچھلی کو خدا سمجھتی ہے۔ جب ہم بلیک ہول کے تصور سے نکل کر پھیلی ہوئی کہکشاں کو دیکھتے ہیں جو اب دریافت ہوئی ہیں اور ہم سے کئی بلین نوری سال کے فاصلے پر ہیں' مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کا یہ طریق جستجو بہت ہی تھکا دینے والا ہے۔ اس کے پاس اتنی عمر اور زندگی نہیں کہ وہ اس مقصد شناخت کی تکمیل کر سکے گا۔ اس پر انسان پر ایک ڈیپریشن اور اداسی چھا جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار تو نے مجھے Glaxial Order کی عمر دی ہوتی کہ اتنی لمبی عمر میں' میں سوچتا اور ستاروں' آسمان اور فلکیات کے اس دور سے گزرتا ہوا اشراق صدی تک پہنچ جاتا۔ میں اس طاق تک جھانک لیتا جہاں تو بیٹھتا ہے۔ یہ تو ممکن نہیں تو پھر میں تجھے کہاں ڈھونڈوں؟ اور کس طرح تلاش کروں؟ مگر اس مایوسی کا علاج موجود ہے کہ خدا کی تلاش کا ایک آسان راستہ بھی ہے' جس کی رفتار بہت زیادہ ہے۔ دنیا کا تیز ترین پیغام وہ ہے جو Biokinetics میں گزرتا ہے۔ اس کو زمین پر کچھ پھول مریخ پر موجود پھولوں کو پیغام ارسال کریں تو وہ کمال تیزی کے ساتھ پہنچ جائے گا۔ ایک بات جس کا میں ہمیشہ قائل رہا ہوں یہ ہے کہ سائنس اس چیز کو سائنس کہتی ہے جس کے اصولوں کو اپنے احاطہ میں لے لیتی ہے۔ سائنس اس چیز کو سائنس نہیں کہتی' جس کا کوئی واضح اصول مرتب نہ کر سکے۔ میرا یہ یقین ہے اور امید ہے کہ میرے کچھ پڑھے لکھے دوست اس پر کام کریں گے کہ جذبات' احساسات اور خیالات بھی ایک Scientific Pattern رکھتے ہیں۔ یہ بھی مکمل سائنسز ہیں' مگر مصیبت یہ ہے کہ ابھی

تک حضرت انسان نے اسے سائنس نہیں کہا' کیونکہ اس کے لیے کوئی واضح اور مصدقہ اصول مرتب نہیں ہوئے۔ صوفیا ہی وہ طبقہ ہے جو اس اصول پر عمل پیرا ہیں۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا اللہ کہیں سماتا ہے؟ تو فرمایا کہ اللہ دوعالم میں کہیں نہیں سماتا مگر قلب مومن میں! گویا ہمیں کچھ ایسے Instruments دیئے گئے ہیں جو خدا کا ادراک و تحصیل کر سکتے ہیں۔ جہاں اللہ کے قرب کی سعادت ممکن ہے جو شناخت پروردگار کا اہل ہے۔ اگر انسان اس کا اہل نہ ہوتا تو قبر میں ہر انسان سے یہ سوال کیوں کیا جاتا؟ من ربك ؟ کیا کسی ان پڑھ کا یہ حق نہیں کہ وہ اللہ سے کہے کہ تو نے تو مجھے تعلیم ہی نہیں دی میں تو بالکل ان پڑھ ہوں۔ میں تمہیں کس طرح جواب دوں؟ کہ میرا رب کون تھا۔ خدا نا انصاف نہیں ہے۔ اس نے انسان کو کوئی دوسری صلاحیت بخشی ہو یا نہ' ایک صلاحیت ہر انسان کو بخشی ہے کہ وہ خدا کو پہچان سکتا ہے۔ سوائے دو انسان کے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو انسانوں سے قلم اٹھا لیا گیا ہے۔ وہ جو سویا ہوا ہے اور مجنوں' باقی تمام انسانوں میں صلاحیت شناخت پروردگار موجود ہے۔

مگر جمال پروردگار ان آنکھوں سے نہ دیکھا جا سکے گا۔ میں کل ویلڈنگ میں آکسیجن کا شعلہ دیکھ رہا تھا اور اسے نہ دیکھ سکا۔ تو میرے دل میں خیال آیا کہ حضرت انسان کی تعلّی بہت بڑی ہے۔ یہ کائنات کے ستر ہزار حجابات نوری و ناری والے پروردگار کو بے حجاب دیکھنا چاہتا ہے اور حال یہ ہے کہ آکسیجن کے نیلے شعلے پر نظر نہیں ٹکا سکتا' مگر کیا ہوا نظر آتی ہے؟ کیا اس کا چھونا محسوس نہیں ہوتا؟ کیا جب یہ ٹھنڈی اور نرم ہوتی ہے تو اسے نسیم سحر نہیں کہتے؟ کیا جب وہ دوپہر کو سخت چلے تو اسے باد سموم نہیں کہتے۔ کیا شام کو ساحلوں پر چلنے والی کو Breeze نہیں کہتے۔ کیا آندھی اور تاریکیوں میں اٹھتے ہوئے طوفان کو ہم نہیں پہچانتے۔ ہم ہوا کا ہر رنگ پہچانتے ہیں۔ خدا نظر آئے یا نہ آئے ہم اللہ کا ہر رنگ پہچانتے ہیں۔ وہ ہمارے قریب سے گزرتا ہے۔ ہم اس کی سرسراہٹ محسوس کرتے ہیں۔ ہم اس کا یقین اپنے دل میں پاتے ہیں۔ اس کی محبت کا سرور ہماری نگاہوں میں چھلکتا ہے۔ وہ ہر لمحے میں اپنے وجود کا احساس دیتا ہے۔ اپنی موجودگی کا تعین دیتا ہے' مگر ان لوگوں سے وہ زیادہ ڈیمانڈ نہیں کرتا۔ زیادہ متقی نہیں ڈھونڈتا۔ وہ تو کہتا ہے کہ:

فلا تزکوا انفسکم ھو اعلم بمن اتقیٰ (۳۲:۵۳)

ترجمہ: پس تم اپنی صفائی و تزکیہ خود نہ بیان کرو۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ تم سے کون زیادہ متقی ہے۔

میرے سامنے تم دعویٰ لے کر نہ آنا۔ مت کہو کہ تم پاک ہو، تم مقدس ہو، میں تمہیں اس دن سے جانتا ہوں جب ہم نے تمہیں دامن زمین میں رکھا تھا اور اس وقت سے بھی جانتا ہوں جب میں نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں رکھا تھا۔ دونوں ہی آغاز غلیظ ہیں۔ جب برستی ہوئی آگ اور برسات تھم گئی، پانچ ہزار ڈگری سینٹی گریڈ کا فشار کرسٹ پر سے ختم ہوا اور زمین پر ایک ارب سال تک بارشیں برسیں اور کیچڑ ہوا پانی سوکھا اور اوپر کی سطح سیاہ ہو گئی:

انا خلقنھم من طین لازب (۳۷:۱۱)

ترجمہ: بے شک ہم نے تمہیں چپکتی ہوئی سیاہ مٹی سے پیدا کیا۔

کھنکھناتے ہوئے خشک گارے کی مٹی کے نیچے سیاہ گلا سڑا لیس دار طین لازب پیدا ہوا اور پروردگار نے اس کی نشاندہی کی کہ تم اپنے تقدس کی بات کرتے ہو حالانکہ تم تو کسی شمار میں نہ تھے۔ تمہیں تو ابھی تک انسان بھی نہ کہا گیا تھا۔ آدم تو بڑے دور کی بات ہے۔ اے حضرت انسان آدم علیہ السلام تو بہت بعد کا تذکرہ ہے۔ تو تو ایک ایسے زمانے سے گزرا ہے جب تو کوئی قابل تذکرہ شے بھی نہ تھا:

هل اتی علی الانسان حین من الدهر لم یکن شیاء مذکورا (۷۶:۱)

ترجمہ: انسان پر ایک ایسا وقت بھی گزرا جب وہ کوئی قابل تذکرہ شے نہ تھا۔

یعنی کسی پرانے سمندر کے کنارے جما ہوا کائی کا ٹکڑا۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ ایک طویل عرصے تک حیات و موت کی جنگ ہوئی۔ پھر نسل انسان نے ایک سودا کیا کہ اے پروردگار میں کہ حقیر کائی کی صورت پڑا ہوں۔ موت قبول کرتا ہوں تو مجھے زندگی عطا کر دے۔ اس طرح موت و حیات کی کشمکش کا آغاز ہوا۔ آج جو کچھ آپ کا وجود ہے یہ ایک واحد Cell سے پیدا ہوا جسے Amoeba Proteus کہتے ہیں جو دو نہیں ہے بلکہ ایک ہی مرکز سے تقسیم ہوتا ہے۔ پھر دوسری منزل آئی:

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتلیه فجعلنه سمیعا بصیرا (۷۶:۲)

ترجمہ: بے شک ہم نے انسان کو مخلوط (دھرے) نطفے سے پیدا کیا کہ اسے آزمائیں، پس ہم نے اسے سنتا دیکھتا بنایا۔

اب اس مرحلے پر نطفہ مخلوط کر دیا گیا۔ نیو کلیس کے Male اور Female ہونے کو Define کر دیا گیا۔ اس مرحلے پر لاکھوں سال گزر گئے۔ پھر اللہ نے چاہا کہ اسے پراگریس دے کہ اسے جانچا اور پرکھا جائے تو اسے دو سسٹم یعنی سماعت اور بصارت دیئے گئے۔ آج کوئی بھی سائنسی تحقیق اس کے خلاف نہیں جاتی۔ اکبر الہ آبادی نے جب جدید سائنسی تحقیقات کو دیکھا تو گھبرا گئے۔ انہوں نے کہا کہ دین و مذہب میں کوئی ایسی صورت نہیں کہ اسے قبول کیا جائے۔ سو انہوں نے طنزیہ انداز اختیار کیا' حالانکہ ڈارون نے تحقیق اور جستجو کے بعد دس سال کی محنت شاقہ سے صرف یہ بتایا کہ دنیا کا کوئی ذی حیات بغیر خاندان کے نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ تمام ذی حیات مختلف فائلمز پر مشتمل ہیں اور پھر ان کے سب فائلم اور فیملی ہیں۔ Genesis ہیں۔ یعنی اس نے اشیائے زندگی کے خاندانوں کی نشاندہی کی۔ ذرا دیکھئے کہ قرآن کیا کہتا ہے:

وما من دابة في الارض ولا طٰئر يطير بجنا حيه الاامم امثالكم (۶:۳۸)

ترجمہ: اور زمین پر کوئی چلنے والا جانور اور اپنے پروں سے اڑنے والا پرندہ نہیں' مگر یہ سب تمہاری طرح کے (مخلوق کے) گروہ ہیں۔

کہ تمام مخلوق تمہاری طرح کی امتیں ہیں۔ یعنی ۱۵سو سال قبل قرآن نے حیات کی اس Category کی نشاندہی کر دی۔ ڈارون نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ Homoerectus انسان نے زندگی میں بڑے ادوار گزارے ہیں وہ کبھی سماعت سے محروم تھا' کبھی بصارت سے محروم تھا' کبھی ڈبل سیل کی شکل میں تھا' کبھی واحد خلیہ کی شکل میں تھا۔ جب وہ Homoerectus بن گیا۔ تو اسی وقت وہ قتل غارت گری میں پڑ گیا۔ پروردگار کا حکم آیا کہ ہم نے اسے زمین پر عقل و معرفت کا نمونہ حکمت بنایا ہے۔ اسے خلیفۃ اللہ بنایا ہے تو وہ فرشتے جو اس تمام Progress of Homoerectus کو دیکھ رہے تھے عرض کرنے لگے:

قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدمآء (۲:۳۰)

ترجمہ: فرشتے کہنے لگے' اے اللہ کیا تو اسے خلیفہ بنائے گا جو زمین پر فساد کرتا ہے اور خون بہاتا ہے۔

یعنی اس کو تو ہم صبح و شام قتل و غارت کرتے دیکھ رہے ہیں۔ اے اللہ تو اسے خلیفہ بنائے گا۔

ارشاد ہوا:

قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السموات و الارض واعلم ما تبدون وماکنتم تکتمون (۲:۳۳)

ترجمہ:(اللہ نے) فرمایا کہ میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمینوں کے غیب جانتا ہوں اور وہ کچھ جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہوئے اور وہ بھی جو تم چھپاتے ہو۔
یعنی میں جانتا ہوں اور تم نہیں جانتے۔ یہ وہ حضرت انسان تھا جو پراگریس کرتے ہوئے پہلے شناخت شدہ آدم کہلایا۔ غرضیکہ ایک نہیں بے شمار سائنسی ایجادات ہیں جو قرآنی حقائق کو Confirm کرتی ہیں اور انسان کے اندر داعیہ پیدا کرتی ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ عقل و شعور کی نعمت کو اپنی ترجیح اول یعنی اللہ تعالیٰ کی شناخت کے لیے وقف کرے۔

وماعلینا الاالبلاغ المبینO

خطبہ دوم

علم اور اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

رب ادخلنی مدخل مصدق و اخرجنی مخرج صدق و اجعل لی من لدنک سلطنا نصیراO (۱۷:۸۰)

یہ موضوع میری زندگی میں بھی ایک انتہائی اہم موضوع رہا ہے۔ تجربات علم اور حوادث شعور سے گزرتے ہوئے نصف صدی کے بعد تمام سوال و جواب کی کاوشوں سے نمٹتے ہوئے ایک انتہائی اکتشاف علمیہ جو مجھ پر پہلے بھی ہوا اور آج بھی ہے' وہ بڑا سادہ سا ہے۔ میں اس اکتشاف کو اس گفتگو کی بنیاد بنا رہا ہوں کہ تمام تحقیق و تجسّس فکر کا صرف ایک فطری انجام ہے اور وہ اللہ ہے۔ اسے غور سے سمجھئے گا کہ تمام تحقیق علمیہ اور تمام تجسس فکر کا ایک انجام ہے اور وہ اللہ ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنی علم و جستجو اور فکری کاوشوں کے بعد اللہ تک نہیں پہنچا' اسے شناخت خداوند حاصل نہیں ہوئی تو اسے واپس پلٹ کر دیکھنا چاہئے کہ اس کی تحقیق علم کہاں ناقص رہی۔ اس کی کاوش فکری کہاں خام رہی۔ سب سے بڑا نقص جو اس وقت علمی فضا میں جاری ہے' وہ تقسیم علم (Compartmentalization of knowledge) ہے۔ تمام علم اجزاء میں منتشر ہے۔ جو چند فکری حلقوں میں بٹ کر ایک مکمل نظریاتی کاوش قائم نہیں کرنے دیتا' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم آج جسے تخصص (Specialization) کہتے ہیں اور جو یقیناً آج کے زمانے میں بڑی علمی مقدریت کی بات ہے۔ وہی علمی تخصص علم محدود کرنے کا باعث بھی ہے۔ اللہ خود علیم ہے اور جب اس نے کائنات کو تخلیق کیا اول و آخر کو سمیٹا تو ظاہر و باطن پر ایک کلی نگاہ ڈالی اور اپنے احاطہ و ادراک میں وضاحت کرنی چاہی' تو اس نے ایک بڑی مختصر سی قرآنی آیت میں ہمیں بتایا کہ اللہ کے نزدیک علم کتنا ضروری ہے۔ اس کا اظہار اس نفرت اور حقارت سے ہوتا ہے' جو وہ علم سے

محروم ذہن کے لیے رکھتا ہے اور اس نے واضح طور پر کہا:

ان شر الدواب عنداللہ الصم البکم الذین لا یعقلون. (۲۲:۸)

ترجمہ: بے شک اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ برے جانور وہ لوگ ہیں' جو بہرے گونگے ہیں اور عقل استعمال نہیں کرتے۔

پروردگار عالم کی عظیم ترین پیدا کردہ تخلیقات پر شعوری کاوشوں سے بہرہ مند نہ ہونے والے عقل و شعور سے محروم لوگوں کو بدترین جانور قرار دیا گیا۔ وہ کون سا شعور ہے جو پروردگار کی پہچان دیتا ہے' وہ کیا علم ہے جو ہمیں اللہ کو ہم پر زیادہ بہتر انداز سے اجاگر کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:-

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء. (۲۸:۳۵)

ترجمہ: بے شک اللہ سے سب سے زیادہ وہی لوگ ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

یعنی اللہ کا علم رکھنے والے ہی سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتے ہیں۔ یہ ڈرنا کیا ہے؟ یہ دراصل اس کی حیثیت کا ادراک ہے۔ پروردگار کی حیثیت کا پہچانا جانا۔ اگرچہ وہ کلی طور پر کسی جزوی حیثیت میں نہیں سما سکتا مگر جب تک ہم اپنی شعوری حیثیت کو بالاتر نہیں کریں گے ہمارا تصور خدا بالکل وہیں تک محدود رہے گا۔ جیسے یورپی فلاسفر نے کہا کہ اللہ کا تصور انسانوں میں بالکل ایسا ہی ہے' جیسے چھوٹی مچھلی بڑی مچھلی کو خدا سمجھتی ہے۔

وہ پروردگار عالم جو علم کی بنیاد پر انسانوں کے درجات مرتب کرتا ہے۔ وہ پروردگار عالم جو اپنے لیے تجسس فکر کو لازم قرار دیتا ہے' ضروری قرار دیتا ہے کہ بغیر علم تم معرفت الٰہی حاصل نہیں کر سکے۔ جو بار بار یہ Assert کرتا ہے کہ مجھے جاننے کے لیے تمہیں اپنا جاننا ضروری ہے۔ تمہیں اپنا جاننے کے لیے ان تمام فکری اور نظری کاوشوں کی ضرورت ہے' جسے آپ دنیاوی علوم کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔ مذہب میں اس وقت زوال پذیری شروع ہوئی' جب اخلاق اور سائنسز زوال آشنا ہونے لگے۔ کبھی وہ وقت تھا کہ مدرسہ اسلامیہ میں چار مضمون لازم تھے اور یہ مذہبی تعلیم کا لازمی جزو تھے۔ ان میں ایک Cosmology ہے' علم ہیئت ہے' علم ہندسہ ہے اور علم منطق ہے۔ ہر اس مسلمان طالب علم کے لیے لازمی سمجھے جاتے تھے' جو دینی اور دنیاوی علوم کے حصول کی کوشش کر رہا ہوتا تھا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ اتنے جدید ترفشارِ معلومات (Flux of Information) کے دور میں آج ہم ایسے دینی علوم کی پیروی کر رہے ہیں' جس میں تمام دنیاوی علوم کا اخراج باعث تفاخر سمجھا گیا

ہے۔ جس میں الیکٹرانکس کو نہ جاننا' ریاضیاتی اصول (Mathematical proposition) کا نہ جاننا' جس میں زماں و مکاں کی علم ہیئت کی رو سے تقرری کو نہ سمجھنا' جس کے اندر پروردگار کی وسیع ترین کائنات بکھری ہوئی ہے۔ بے شمار کہکشاؤں کو نہ جاننا مذہب کا کمال سمجھا گیا۔ مذہبی عالم کی فراست کا یہ عالم ہے کہ وہ تمام تر جدید ترین معلومات کو نقص فطرت اور نقص اسلام سمجھتا ہے۔

جس پروردگار کے نظام میں کوئی بھی چیز غیر سائنسی اور غیر اصولی نہ ہو' کیا اسے بغیر علم کے سمجھا جاسکتا ہے؟ یہاں میں آپ کو ایک جدید ترین بات بتادوں۔ اتنی حیرت انگیز کہ وہ انسان کے ذہن کو مسحور کر دے' کیونکہ انفس و آفاق میں پروردگار کی انسانی ذہن کو مسحور کر دینے والی ان گنت نشانیاں موجود ہیں۔ جہاں انسان نے تھوڑی سی تحقیق سے کئی غیر معمولی کائناتی مظاہر پر قابو پالیا ہے۔ ان نظری شہادتوں میں سے ایک شہادت ہبل ٹیلی سکوپ کے ذریعے سے ملی ہے کہ ۱۱.۵ بلین سال قبل کائنات میں پہلا دھماکہ ہوا تھا۔ اب جو کائنات کی عمر متعین ہوئی ہے وہ ۱۵ بلین سال ہے۔ اور یہ کائنات دراصل ہمارے احاطۂ علمی تک ہی محدود ہے۔ عین ممکن ہے کہ جب ہم اس کائنات کے کنارے پر پہنچیں تو ایسی ہی بے شمار کائناتیں ہمارا انتظار کر رہی ہوں۔ بگ بینگ کے ذریعے صرف یہی ایک کائنات معرض وجود میں نہیں آئی جس کا تصور ہم نے کیا ہوا ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ آج سے ۱۱.۵ بلین سال قبل جو دھماکہ ہوا' جس سے بے شمار Galaxial Bodies کا آپس میں تصادم ہوا' اس کی روشنی اب زمین پر پہنچی ہے اور سائنس دانوں نے اس سے بڑا عجیب استنباط کیا ہے کہ اگر ہمارے پاس ہبل ٹیلی سکوپ سے زیادہ طاقتور اور بہتر ٹیلی سکوپ ہو تو ہم اس وقت کو بھی پاسکتے ہیں جب ہماری کائنات شروع ہوئی۔ یعنی اگر آج کے دن ہم ۱۱.۵ بلین سال قبل کے آثار تک پہنچ سکتے ہیں تو ایک مؤثر دوربین سے ہم اس دھماکے کا سراغ بھی لگا سکتے ہیں' جو ۱۵ بلین سال قبل ہوا تھا۔

اتنے بڑے Galaxial Order پہ جہاں اس کی وسعتوں پر فاصلے ختم ہو جاتے ہیں' جہاں Space ختم ہو جاتی ہے' جہاں صرف زمانہ ایک اکائی رہ جاتا ہے کہ جس سے ہم فاصلے ماپ سکتے ہیں اور اس طرح معمولی سے معمولی فاصلے کو بھی ناپا جاسکتا ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس لامحدود فاصلے کی پیمائش کے لیے لائٹ ایئر کو متعارف کیا گیا۔ ہم نے روشنی کی شعاع سے چلتے ہوئے ایک سیکنڈ کو لے کر اس کی بنیاد پر فاصلے گنے تو معلوم ہوا کہ یہ کائنات

اتنی بڑی ہے کہ اس کی وسعت کے سامنے نوری سال(Light Year) کا پیمانہ بھی ناقص پڑ جاتا ہے۔ اب مجبوراً سائنس دانوں کو روشنی کی رفتار کے بھی Billion years کے پیکٹ تیار کرنا پڑتے ہیں۔ اور ان پیکٹس کو وہ بحیثیت پہلی اکائی استعمال کرتے strength ہیں' تاکہ ایسے بلین پیکٹس جمع کر کے شاید ہم کائنات کے ان وسیع ترین پیمانوں کو یا اس پھیلی ہوئی کائنات کی وسعتوں کو کسی قدر احاطہ انسانی میں لا سکیں۔

اتنی بڑی وسیع کائنات کا مالک کسی طرح بھی کسی جاہل ذہن میں نہیں آسکتا۔ کسی کم علم ذہن میں نہیں آسکتا اور یہ کہ اس وسیع تر کائنات کے ایک طرف میکروکارڈز بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ کائنات بالا بھی پھیلی ہوئی ہے اور اس مختصر ترین کائنات کے بارے بھی پروردگار کا ارشاد ہے:-

وفی الارض آیات للموقنینo و فی انفسکم افلاتبصرونo (۵۱:۲۰'۲۱)

ترجمہ: اور زمین میں یقین والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اور تمہارے انفس میں بھی کیا تم نہیں دیکھتے۔

گویا فرمایا جارہا ہے کہ اگر میں نے کائنات بالا میں اپنی نشانیاں رکھ دی ہیں جو تمہیں اتنی وسیع نظر آتی ہے کہ اس کے اقطار السموات سے تمہارا ذہن نکل نہیں سکتا' تو کم از کم اس کائنات کو دیکھنے کی کوشش کرو جو تمہارے اندر ہے۔ وہ نشانیاں' جو تمہارے اپنے اندر اور تمہارے اپنے سسٹم میں ہیں۔ کیا تمہیں یہ حیرت انگیز تجاوزات نظر نہیں آتے؟ بڑی باتوں کا ذکر کیا جو جلتا ہوا چراغ ہے اس کا ذکر کیا۔ چاند کا ذکر کیا جو اس کے پیچھے آتا ہے۔ جو اس سے روشنی ادھار لیتا ہے۔ اس نے رات کا ذکر کیا جو اندھیری ہے۔ اس نے دن کا ذکر کیا' جو روشن ہے۔ اس نے زمین کا ذکر کیا' جس کی حکمت اس نے اس کے پھیلاؤ میں رکھی ہے۔ اس نے فرمایا:-

ونفس وما سوھافا لھمھا فجورھا وتقوھا (۹۱:۷'۸)

ترجمہ: اور نفس کی قسم اور اس کی کہ اسے درست کیا اور اس میں الہام کیا اس کا گناہ کرنا اور تقویٰ اختیار کرنا۔

پھر اے حضرت انسان میں نے تمہارے نفس کو درست کیا۔ میں نے ایک Original انسان کے Makeup کو درست کیا۔ اور پھر میں نے اس نفس انسان کو درست کرنے کے بعد' برابر کرنے کے بعد' اس میں خیر و شر کے پہلو متوازن کرنے کے بعد' اس پر میں نے

الہام کیے۔ بڑی عجیب بات ہے کہ پروردگار فرمارہا ہے کہ نیکی کا خیال تمہارا نہیں، شر کا خیال تمہارا نہیں دونوں طرف کے خیالات میں ہی الہام کرتا ہوں۔ میں نے ہی اس پر الہام فسق و فجور کیا۔ میں نے ہی اس پر الہام کیے نیکی اور تقویٰ کے خیالات۔ تمہارا کام صرف سوچنا، سمجھنا، غور کرنا اور انتخاب کرنا رہ گیا۔ یعنی ہر انسان کو زندگی میں اس پل صراط سے گزرنا ہوگا، علم و تعلیم کے اس معیار سے گزرنا ہوگا، اسے جانچ پرکھ کی ہر کڑی کو سیکھنا ہوگا۔ اس لیے کہ کوئی انسان خدا کی معرفت کو حاصل نہیں کر سکتا، جب تک کہ اس کے پاس علم اور شناخت نہ ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب سارے علم والے تو نہیں ہو سکتے۔ وہ کہاں جائے گا جس کی گنجائش علم اتنی نہ ہو سکے، جس کی فکری کاوش شاید اس ابلاغ کے اظہار تک نہیں پہنچ سکی، جو کسی یونیورسٹی میں نہیں پڑھا، جس نے فلکیات نہیں پڑھے، جس نے علوم دینی و دنیاوی کی کوئی تعمیل نہیں کی۔ تو عقل یہاں آکر دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ کہ محرومی عقل تو صرف مجنون کو ہے، اختلاج عقل تو صرف بے شعور کو ہے اور جہاں تک ایک بے عقل و مجنون کا ذکر ہے تو پروردگار نے بالکل واضح طور پر کہہ دیا: حدیث نبویؐ ہے کہ مجنون کو رخصت دے دی گئی ہے، مگر جس کے پاس عقل، معرفت کو سمجھنے کا پیمانہ موجود ہے، تو اللہ اس سے توقع کرتا ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ ضرور میری معرفت کو پالے گا۔ اگر پانے کی کوشش کرے گا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت ہمارا رویہ کیا ہونا چاہئے؟ تو اس کے جواب میں، میں چند جملے تقلید کے بارے میں کہوں گا۔ ایک گروہ فکر ہے، جو تقلید کو انتہائی برا کہتا ہے اور ایک گروہ فکر ہے، جو تقلید کو ادب سمجھتا ہے۔ اور معیار اخلاق تصور کرتا ہے۔ ان میں فرق صرف اتنا ہے کہ عاقل کے لیے، پڑھے لکھے کے لیے تو معرفت و تحقیق و جستجو ہے اور کم پڑھے لکھے کا معیار عقل یہ ہے کہ وہ اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے مناسب استاد تک پہنچے۔ یعنی کم پڑھے لکھے کی معراج یہ ہے کہ وہ خدا شناس تک پہنچے۔ اگر اسے تقلید ہی کرنی ہے، اگر اسے جاننے کی کوشش میں کچھ مشکل نہیں آتی ہے، اگر اسے پتہ ہے کہ میرے پاس وہ Instrument نہیں ہے، میرے پاس تو وہ سہولت موجود نہیں ہے، میں کسی جبر و اکراہ کی وجہ سے، کسی مجبوری کی وجہ سے علم کے معیار تک نہیں پہنچ سکا، جس کے لیے میں ذاتی طور پر خدا شناسی کا اہل ہو سکوں، تو اس کے لیے معراج عقل یہ ہے کہ وہ اپنے جبلی شعور، کو اپنی عمومی ذہانت کو استعمال کرتے ہوئے کسی خدا شناس تک پہنچ جائے، تو اس کا کام بھی پورا ہو جائے گا اور پروردگار کی اس پر سے ذمہ داری بھی اٹھ جائے گی۔

تصور علم کے باب میں یورپ میں تمام لوگوں کی معرفت علمیہ بڑی عجیب سی تھی۔ مفکرین نے اور مبلغین فکر نے جو یورپ میں ہیں' فلاسفرز نے' دانشوروں نے جتنی بھی رائے کو جمع کیا اور علم کے بارے میں جتنی بھی رائے جمع کی انہیں مختصراً انسائیکلو پیڈیا آف برٹینیکا ایک جملے میں یوں سمیٹتا ہے:

"تمام علم کا مطلب شعور ذات ہے۔"

یعنی گریک' رومن' مصری دیومالائیت سے لے کر آج تک' بابل و نینوا کے مفکرین ہوں یا وادی فرات کی تہذیب کے مفکرین' تمام تہذیبوں کے مفکرین کو سامنے رکھتے ہوئے' دور حاضر کے فلسفیوں کو سامنے رکھتے ہوئے جب ان کی آراء کا خلاصہ (Nutshell) نکالا جاتا ہے تو وہ یہی ہے کہ علم صرف مراد صرف ایک ہی حقیقت ہے اور وہ ہے اپنے آپ کو جاننا یا بالفاظ دیگر "شعور ذات" اس جگہ انسائیکلو پیڈیا آف برٹینیکا ایک فرق بھی بیان کرتا ہے' جو مغرب و مسلم دنیا کے مفکرین کی رائے میں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں میں علم کا مفہوم بالکل مختلف ہے۔ جہاں تمام غیر اسلامی مفکرین کی رائے اس امر پر متفق ہے کہ علم اور Intellectual Capacity کا مطلب ہے' اپنے آپ کو جاننا وہیں تمام مسلم مفکرین کا نقطۂ نظر ہے کہ علم اور Intellectual Capacity کا مفہوم ہے "خدا کو جاننا۔"

گویا دور جدید میں آکر علم کے نقطۂ نظر کے باب میں ہمارے سامنے دو طرح کی شعوری کاوشیں آتی ہیں کہ علم کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایسی دلیل تلاش کرنا' جو علم کے نظریہ کو Justify کر سکے۔ نظریہ خواہ غلط ہو' خواہ صحیح' تمام علم کا مقصد یہی ہے کہ آپ جس نظریے پر قائم ہیں' اس کے مطابق دلائل تلاش کرنا اور اگر آپ اس کے مطابق دلیل تلاش نہیں کر سکے' تو جس نظریۂ علم پر آپ کھڑے ہیں' وہ غلط ہے۔ اور اگر دلیل تلاش کر لیتے ہیں تو وہ نظریۂ علم صحیح ہے' چاہے اصلاً اور فی الحقیقت وہ اخلاقی ہو یا غیر اخلاقی' عملی ہو یا عمومی نوعیت کا۔ اس امر سے بحث نہیں ہے کہ وہ نظریۂ علم فی نفسہ بھی ثقاہت اور صحت کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں' بلکہ تمام تر انحصار دلیل پر ہی کیا جائے گا کہ آپ کے نظریۂ علم کی درستگی اسی میں ہے کہ آپ کو دلیل مل جائے۔ اور پھر کچھ مفکرین کی رائے ہے کہ علم سماجی و معاشرتی ربط وضبط (Social Relationship) کا نام ہے۔ اگر آپ کے علم سے ایک معاشرہ ہموار نہیں ہو رہا تو پھر آپ کے علم میں خامی ہے' لہٰذا ایک نئے اصول علم کی تلاش کرنا ہو گی اور ایک نئے نظریاتی استدلال کا نظم قائم کیا جائے گا' جو آپ کے معاشرتی اور سماجی بحران کو

متوازن کر سکے۔

مگر یہ بات اسلام اور اہل اسلام میں نہیں ہے۔ یہاں علم کا ماخذ اللہ ہے۔ اسلام میں پہلا اور اول و آخر عالم اللہ ہے۔ اسلام میں اللہ کے بعد سب سے بڑے عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسلام میں علم کی وہ نوعیت نہیں، جو آج کے مغربی مفکرین و فلاسفر کہہ رہے ہیں۔ جیسے لارڈ برٹرنیڈ رسل کہتا ہے آج ہم تمام جدید ترین تحقیقات اور علمی کاوشوں کے باوجود حقیقت علم سے آگاہ نہیں بلکہ:

"We only know the relationship of things.

We do not know the nature of things."

اگر یہ بات کسی عام شخص نے کہی ہوتی تو شاید نظر انداز کر دی جاتی، مگر یہ بات رسل کہہ رہا ہے، جس کے نام کے ساتھ بیسویں صدی کو موسوم کیا گیا ہے۔ جسے اپنی صدی کا نمایاں اور سر کردہ سکالر اور فلسفی قرار دیا گیا ہے۔ جو آج کی یورپی قیادت علمیہ کا نمایاں ترین فرد ہے۔ جسے آج معزز اور مقتدر استاد کہا جاتا ہے، جس کی وفات کے بعد بیسویں صدی کو اس کے نام کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔ یہ ساری تفصیل اس لیے عرض کی جارہی ہے تاکہ آپ کو اس کے علمی اقتدار کا اندازہ ہو سکے کہ وہ علمی اقتدار کی اس منزل پر پہنچ کر علم کی شناخت کے بارے جو بیان دیتا ہے کہ ہم صرف اشیاء کے مابین تعلق کو جانتے ہیں اور فطرت اشیاء کو نہیں جانتے، اس کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔

اب نبی امی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دعا پر غور کیجئے جو آپؐ نے بارگاہ رب ذوالجلال میں فرمائی:

اللھم ارنی حقائق الاشیاء کماھی (الحدیث)

ترجمہ: اے اللہ مجھے اشیاء کی حقیقت ایسے ہی دکھا جس طرح کہ وہ ہے۔

یعنی مغرب جس مقام علم پر اپنی بے پناہ تحقیق و جستجو کی وجہ سے پہنچا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علمی سفر کا آغاز اس مقام سے فرما رہے ہیں اور اسے اپنی امت کے لیے طلب علم کا نکتہ اول متعین فرما رہے ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ حضور گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ وحی ہے۔ جو کلام مقدس کا حصہ ہے وہ متلو اور جو حصہ نہیں ہے وہ وحی غیر متلو ہے۔ اس لیے کہ پروردگار عالم نے قرآن میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری

زندگی کی "لعمرك" فرما کر قسم اٹھائی۔ ایسے لگتا ہے کہ خدا اپنے دوست کے ذکر پر جذباتی ہو گیا۔ یہ تو ایسے ہی ہے جس طرح کسی کے سر کی قسم اٹھانا۔ اللہ کو اپنے پیغمبر سے اتنی محبت ہے کہ وہ آپؐ کی عمر کی قسم اٹھاتا ہے۔ کہ اے پیغمبر محمد تیری عمر مقدس کی قسم ہے' مگر یہ اللہ کا جذباتی بیان نہیں ہے۔ یہاں عمر مقدس کی قسم اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ پروردگار نے اس وقت سے جب رسول اللہ ﷺ کا نور پہلی مرتبہ تخلیق کیا' اور پھر جب خدا نے اپنے دوست کو جدا کر کے زمین پر رخصت کیا' اور پھر وہ عمر جو زماں و مکاں کے تصرف سے بالا ہے اور وہ عمر جو زمین پر ہے اور قیود زماں و مکاں میں ہے' غرضیکہ آپؐ کی عمر کا ہر ہر لمحہ اللہ نے گنا ہوا ہے اور جب اس ایک ایک لمحے پر اللہ کا اتنا نگران کنٹرول ہے' تو پھر اس رسول کی کوئی بات بھی بغیر حکم الٰہی کے نہیں ہو سکتی۔ کوئی بات اپنی طرف سے نہیں ہو سکتی۔ اس کا ایک لفظ بھی خدا کے فرمان سے جدا نہیں ہو سکتا' چاہے ہمیں اجتہادی طور پر غلط ہی کیوں نہ لگے۔

ارشاد ربانی ہے:-

وما ينطق عن الهوىٰ ० ان هو الا وحي يوحي ' ○ (۵۳:۳'۴)

ترجمہ: "اور یہ رسول ﷺ اپنی خواہش نفس سے کچھ نہیں فرماتے' بلکہ ان کا کلام تو وہی کچھ ہے جو ان کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔"

جیسے ہمیں ایک دو احادیث پر اجتہادی طور پر غلطی کا گمان گزرتا ہے کہ آپؐ نے ایک بات کہی اور وہ پوری نہ ہو سکی' مگر جب ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑی Well Studied Mistake تھی۔ ایک دفعہ کچھ اصحاب حضور گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے عرض کی یا رسول اللہؐ! ہم کھجور کو پیوند لگانا چاہتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں تو پیوند پسند نہیں کرتا۔ ان اصحاب کرام نے اگلے سال پیوند نہیں کی! اس طرح فصل کو نقصان ہوا۔ جب وہ اگلے برس آئے تو بہت اداس تھے کہنے لگے یا رسول اللہؐ! آپ کے کہنے پر ہم نے پیوند نہیں کی فصل بڑی خراب ہو گئی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایسے کیا کرو جس طرح تمہارا تجربہ کہتا ہے۔

اللہ کے رسولؐ نے تجربیت (Experimantation) کو اتنی وسعت بخشی کہ آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کو بھی دنیوی معاملات میں آزادانہ سوچ کا موقع دیا۔ اس حدیث کا مطلب ہے کہ آپ گمان اور وسوسوں میں نہ رہیں بلکہ تجربہ کو بھی اس کی اہمیت دیں کہ یہ خدا کی دین ہے۔ انسان کو تو ملائکہ پر برتری ہی اللہ نے ایک علمی وصف سے بخشی۔ ملائکہ کے

پاس Priority کوئی نہیں۔ سابقہ چیز کوئی نہیں۔ علم کے تسلسل کو قائم رکھنے کی روایت کوئی نہیں۔ ملائیکہ تو مخصوص پروگرام پر چلنے والی مخلوق ہیں۔ جتنا ان کو ریکارڈ میں دیا جاتا ہے اس سے آدھا لمحہ آگے جا سکتے ہیں نہ ہی پیچھے جا سکتے ہیں۔ جب استاد اول و آخر نے اپنے شاگرد کو علم سکھایا:

وعلم آدم الاسماء کلھا (۳۱:۲)

ترجمہ: اور (اللہ نے) آدمؑ کو ہر (چیز کے) اسماء کا علم سکھایا۔

کہ آدمؑ تو بھی ان اسماء کو سیکھ اور اے ملائیکہ تم بھی سیکھو۔ اور میں نے جس نقطۂ علم پر انسان کی معراج عقل رکھی اور جس نقطۂ علمی پر میں نے تمہیں فوقیت بخشی ہے وہ تم خود جان جاؤ۔ انسان کی زبان کی پراگریس میں ہزاروں سال لگ گئے۔ انسان نے اشارہ سے بولنا سیکھا' پھر وہ کلام تک پہنچا۔ پہلے اس کے پاس صرف Symbol اور علامت تھی۔ پھر وہ علامت سے اشارے تک آیا۔ علم کائنات اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ انسان نے سب سے پہلے وہی علم سیکھا جس کی قرآن میں نشاندہی ہو رہی ہے:۔

ثم عرضھم علی الملئکۃ فقال انبئونی باسماء ھولاء ان کنتم صدقین (۳۱:۲)

ترجمہ: پھر (اللہ نے) یہ سب کچھ فرشتوں کے سامنے رکھا اور فرمایا مجھے ان کے اسماء بتاؤ اگر تم سچے ہو۔

قالوا سبحنک لاعلم لنا الاما علمتنا انک انت العلیم الحکیم (۳۲:۲)

ترجمہ: فرشتے کہنے لگے کہ اے اللہ! تو پاک ہے ہمیں اس کا علم نہیں۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جو تو نے ہمیں سکھایا۔ بے شک تو جاننے والا حکمت والا ہے۔

اے علم و حکیم اب ہمیں صرف اتنی بات کا علم ہے' جتنا تو نے ہمیں بتایا ہے۔ اس سے آگے ہم کسی چیز کا استنباط نہیں کر سکتے۔ ہم کوئی چیز اخذ نہیں کر سکتے۔ ہم کوئی چیز اس میں شامل نہیں کر سکتے۔ ہم ماضی سے کوئی تجربہ نہیں اٹھا سکتے۔ ہم مستقبل تک وہ تجربہ نہیں پہنچا سکتے۔ یہ صرف انسان کی یادداشت کی صلاحیت ہے۔ اسے اختراعی ذہن بخشا گیا ہے۔ وہ ذہن کی ان تواردات میں فیصلہ کرتا ہے۔ وہ اپنے سابقہ زندگی سے علم اٹھاتا ہے' اسے موجود میں استعمال کرتے ہیں۔ مستقبل میں آنے والی نسلوں کے لیے اشارات چھوڑ دیتا ہے۔ اس لیے جب پروردگار نے فرمایا کہ اے آدمؑ! تو نے اس تختی کا کیا کیا؟ تو اس نے فرفر سنانا شروع کر دیا۔ ایک ایک حرف سے اس نے ایک ایک کتاب ترتیب دی تھی۔ اور اس کائنات میں

موجود ہر چیز کا نام اس نے حروف تہجی کی مدد سے رکھ لیا تھا۔ یہی وہ علمی سعادت تھی' جو انسان کو نصیب ہوئی اور جس کو اللہ نے قائم کیا اور اس علمی سعادت کے بعد اسے عملاً ثابت کرنے کے بعد جب اس نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اب اسے سجدہ کرو تو چونکہ ملائیکہ اس تجربہ کی ناکامی سے گزر چکے تھے' سووہ سجدے میں گر پڑے۔ جس کی وجہ سے اللہ نے انسان کو مقرر کیا۔ علم ہی وہ متاع ہے' جس کی بنیاد پر انسان کو اللہ کا جاننا قرار پایا۔ جب اللہ نے انسان کی ابتدا گنوائی' اس کی طبیعاتی پراگریس گنوائی' اس کی حیاتیاتی زندگی کا ارتقا گنوایا' اس کے بعد اس کے تعقل کو گنوایا تو فرمایا:-

هل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیاء مذکورا (۷۶:۱)

ترجمہ:- انسان پر ایک ایسا وقت بھی گزرا جب وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔

بلاشبہ زمانے میں انسان پر بہت طویل عرصہ ایسا گزرا ہے' جس میں کہ وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی وجود کے Pattren میں نہیں تھا۔ وہ کوئی ایلجی تھا۔ کوئی نباتاتی فارم میں وہ کسی یک خلوی پوزیشن میں تھا۔ وہ کوئی ایمیبا تھا۔ وہ کیا چیز تھا کہ قابل ذکر تک نہ تھا' کیونکہ آدم تو بہت ہی قابل ذکر ہے۔ خدا تو ایک ایسے وجود کی نشاندہی کر رہا ہے اور اسے سنا رہا ہے اسے فرمائش کے انداز میں سنا رہا ہے کہ اے حضرت انسان! کبھی تم نے اپنی ابتدا پر غور کیا؟ کبھی تم نے یہ جاننے کی کوشش کی۔ اس آیت میں دھر استعمال کیا کیونکہ دھر ایک ایسی حیقت ہے' جس کے بارے میں کہا گیا:

لاتسبوا الدھر ان الدھر ھو اللّٰہ (الحدیث)

ترجمہ: زمانے کو برا نہ کہو' اللہ ہی زمانہ ہے۔

زمانے کو برا مت کہو' زمانہ میں خود ہوں۔ اس لیے انسان کے ناقابل تذکرہ دور کے بارے رب ذوالجلال نے دھر کا لفظ استعمال کیا اور پھر کروڑوں سال بعد وہ مرحلہ آیا:

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتلیه فجعلنه سمیعا بصیرا (۷۶:۲)

ترجمہ: بے شک ہم نے انسان کو (باہم آمیختہ) دھرے نطفے سے پیدا کیا۔ کہ ہم اسے آزمائیں پس ہم نے اسے سنتا دیکھتا بنایا۔

دوہرے نطفے سے مراد یہ ہے کہ انسان کو یک خلوی (Uni Celluler) حالت سے نکال کر دوہری خلوی حالت (Double Celluler) میں ڈال دیا گیا۔ یہ ایک اتفاق کی بات ہے کہ انسان کی اس منزل کا گواہ آج بھی ہم میں موجود ہے۔ ہر آدمی میں' ہر انسان میں وہ

گواہ موجود ہے جسے ہم Amoeba Proteus کہتے ہیں۔ڈاکٹر حضرات گواہ ہیں کہ انسان کو ذرا سا بھی اسہال ہو جائے تو آن کی آن میں اسے بے حال کر دیتا ہے۔ یہ اتنی زیادہ تعداد میں بڑھتا ہے۔ یہ یک خلوی مخلوق آگے چل کر دو خلوی ہو گئی۔ جب انسان کو اس طرح ارتقاء کی منزل سے گزارا گیا تو اس کا مقصود پروردگار نے یہ بیان کیا کہ میں انسان کو آزماؤں اس لیے اسے ''سمیعاً بصیراً'' بنایا گیا۔ اور یہ حیرت ہے کہ پہلا سسٹم جو تخلیقات کو دیا گیا وہ بصارت کا نہیں بلکہ سماعت کا تھا۔ اب خدا نے انسان کو سماعت اور بصارت کی منزل تک اٹھا دیا۔ مگر ابھی خدا نے انسان کو وہ Capacity نہیں دی تھی کہ وہ شناخت خداوند حاصل کر سکتا۔ ابھی تک تجربہ میں احتیاط مفقود تھی۔ مگر اگلے مرحلہ پر انسان کو امانت علمیہ سپرد کی گئی کہ اب اسے عقل و شعور بخشا گیا۔ اسے ذوق فہم اور حس جمالیات سے نوازا گیا۔ اسے نور بصیرت عطا کیا گیا۔ اس لیے یہ خلاف عقل ہو گا کہ پروردگار کسی عالم سے توقع کرے کہ وہ ان پڑھ والی بات کرے یا یہ کہ ایک بے علم اٹھ کر اس کی تبلیغ کرے یا بغیر علم و حکمت کے لوگ اس کے بارے میں بات کریں۔ وہ اس کی سخت ممانعت کرتا ہے۔ وہ یہ وضاحت کرتا ہے کہ اگر تم نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے' اگر تمہیں تبلیغ کا شوق ہے تو بغیر علم کبھی بھی اللہ کو بلانے والا نہیں ہونا چاہیے:

ادع الی سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن. (۱۲۵:۱۶)

ترجمہ:- اپنے رب کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور (اللہ کے منکروں سے) اچھی طرح مجادلہ (مکالمہ اور بحث و گفتگو) کرو۔

کہ اللہ کی طرف بلا حکمت سے اور اچھی بات سے مگر وہ یہ نہیں کہتا کہ خالی اچھی بات سے بلکہ بحث و تمحیص سے کہتا ہے۔ خدا کے لیے بحث کرو' خدا کے لیے Dialectical Experiment میں جاؤ۔ اس لیے کہ Dialectics کا موضوع جو آج کے فلاسفر دے رہے ہیں' نیا نہیں ہے۔ یہ تصور تو صدیوں قبل قرآن دے چکا ہے۔ یہ امر باعث حیرت ہے کہ Dialectics کا ترجمہ ہی جدلیات کیا گیا ہے' چاہے وہ ہیگل کی ہو یا مارکس کی وہ جدلیات توحید کی ہو یا مادیت کی اس میں بحث ضرور کرنا پڑتی ہے اور خدا کہتا ہے ان سے بحث کرو۔ ان کی دلیل سن کر انہیں اپنی دلیل دو' مگر طریقہ ٹھیک ہونا چاہیے۔ بحث میں تعزیر نہیں ہونی چاہیے۔ غضب نہیں ہونا چاہیے۔ اہل علم کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اچھا برا برتتے ہیں اور

غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے کہ پروردگار یہ کہتا ہے کہ خالی عبادات سے خوش نہیں ہونا' میرے بہترین بندے وہ نہیں ہیں جو عبادات کے مالک ہیں' بلکہ ہر عبادت گزار سے عالم کو پہنچیں اور ہر عالم سے فقیہہ کو پہنچیں۔ اس لیے کہ عالم علم کے حساب سے جانتا ہے' مگر وہ صاحب اختراع نہیں ہے اور فقیہہ مخترع ہے' جو نئی Situation کا انتخاب کرتا ہے۔ وہ تفقه في الدين سے قائم ہے۔ عالم اور فقیہہ کی مثال ایسے ہے جس طرح ابو سفیان ثوری اور امام اعظم ابو حنیفہ کی مثال ہے۔ جب ایک شخص ان کے پاس آیا اور اس نے امام ابو سفیان ثوری سے پوچھا کہ ایک شخص ایک سیڑھی پر چڑھا ہوا تھا کہ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر میں اس سیڑھی سے نیچے اتروں تو تجھے طلاق ہے۔ ابو سفیان ثوری نے سوچا اور کہا کہ طلاق ہو گئی۔ اب اور کوئی چارہ نہیں رہا۔ مگر یہاں مسئلہ عائلی اور خاندانی زندگی کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا تھا' جسے امام ابو سفیان ثوری کا علم نہ سنبھال سکا۔ جب امام اعظم کے پاس گئے تو انہوں نے کہا میں چل کر دیکھوں گا۔ وہ آئے اور دیکھ کر فرمایا ایک اور سیڑھی لاؤ اور اس کے ساتھ لگا دو۔ اور اس شخص کو کہو کہ وہ اس سیڑھی سے نیچے اتر آئے۔ اب ایک فقیہہ ہے اور ایک عالم ہے۔ اللہ کے نزدیک وہ شخص جو علم میں گنجائش پیدا کرتا ہے' وہ عالم جو قرآن کو انسانوں کے لیے مشقت کا باعث نہیں بناتا' جو علم کو حصول علم میں آسان کرتا ہے جو علم کو تعمیل علم میں آسان کرتا ہے' وہ اتنا بڑا عالم ہے کہ خود حضور گرامی مرتبت صلی اللہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

انما بعثت معلماً. (حدیث)

بے شک مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا۔

حضور علیہ وسلم نے کبھی کسی چیز پر تفاخر نہیں کیا۔ جتنا اس پر کہ اللہ نے آپ کو علم دینے والا پیدا کیا ہے۔ یہ وہ علم ہے جو معرفت انسانی کے لیے ضرورت تھا۔ دیکھئے معرفت انسانی کیا ہے؟ وہ علم کیا ہے جسے پروردگار کہتا ہے:

وفی انفسکم افلا تبصرون. (۲۱:۵۱)

ترجمہ: اور تم اپنے اندر (نفس میں) غور کرو' کیا تم دیکھتے نہیں۔

یعنی اگر تم اپنی ذات پر غور کرو اور اپنے نفس کی تربیت پر غور کرو' اپنی زندگی پر غور کرو تو تم مجھے پا لو گے۔ یعنی علم کی انتہا کو پا لو گے۔ یہاں یہ بات قابل تذکرہ ہے کہ خدا کے پاس علم کا اس سے زیادہ کوئی مصرف نہیں ہے کہ علم برائے زندگی نہیں، علم برائے علم نہیں بلکہ علم

صرف برائے خدا ہے۔ باقی علم کا جتنا بھی استعمال ہے وہ دنیاوی اور ادنیٰ ترجیح ہے۔ ترجیح اولیٰ نہیں ہے۔ اگرچہ ادنیٰ درجوں میں انسان علم کو اور بہت سے مقاصد کے لیے بھی استعمال کرتا ہے' مگر انسانی ذہن کی فکری جستجو کی اعلیٰ ترین منزل صرف اور صرف پروردگار ہے۔ یہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔ اللہ نے آپ کو علم اور کسی کام کے لیے نہیں عطا کیا۔ رہی زندگی کی بات تو یہ علم کی سب سے بڑی غلطی ہے کہ وہ زندگی کی ذمہ داری خود لیتا ہے۔ یعنی یہیں سے علم خطا کا شکار ہوا کہ بجائے اس کے کہ علم کو ترجیح اولیٰ کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے' انسان نے اسے نظر انداز کر کے علم کو اپنی ثانوی ترجیحات کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ آج کے علم فکر اور فرد کا المیہ ہی یہ ہے کہ اس نے کم تر ترجیحات کو زیادہ توجہ دی اور اعلیٰ ترین ترجیحات کو مؤخر کر دیا ہے۔

جس علم کو اپنی ترجیح کا علم نہیں' جسے اپنے اصابت کا انشراح نہیں' جسے اپنے مقصد کی آگاہی نہیں وہ علم کبھی بھی اپنی منزل شناخت حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر آج بھی ہم علم کو اس کی صحیح ترجیح کے لیے استعمال کریں تو کسی بھی انسان کو کوئی انزائٹی (Anxiety) اور بگاڑ (Disturbance) نہیں رہ جاتا۔ علم جبر و قدر کے مسائل حل کرتا ہے۔ آپ سوچیے کہ تمام علمی ترقی جبر و قدر تک آ کر رک جاتی ہے۔ حضور گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب لوگ یہ سوال کرنا شروع کر دیں کہ اللہ سے پہلے کیا تھا تو وہاں سے ہٹ جاؤ۔ کیونکہ بڑی سادہ سی بات ہے کہ جو سوال کر رہا ہے وہ اپنی Intellectual Capacity سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کی معلومات نہیں ہیں۔ اس کا حساب کتاب کم ہے۔ اس کی انفارمیشن اتنی معمولی ہے کہ وہ زندگی میں اپنے قرینے درست نہیں کر سکتا۔ اس کو اپنی گلی محلے کے افراد کا علم نہیں ہے۔ مگر وہ جسارت کر رہا ہے کائنات کے سب سے بڑے سوال کی! ایسے لوگ ذہنی انتشار کا شکار ہوتے ہیں۔ کسی سائنس کے پاس اس کا جواب نہیں ہے کہ پہلا بادام کہاں سے آیا؟ پہلا جانور' پہلا درخت کہاں سے آیا؟ ان سب سوالوں کو حل کرتے کرتے وہ پہلے زندہ خلیہ تک تو پہنچ سکتے ہیں' مگر پھر یہ سوال رہتا ہے کہ پہلا زندہ خلیہ کہاں سے آیا؟ پندرہ ہزار سینٹی گریڈ کے جلے ہوئے درجہ حرارت میں زندگی کا وجود کس طرح ممکن ہوا؟ اگر اس طرح کے حالات آج زمین پر پیدا ہو جائیں تو زندگی محال ہو جائے۔ اگر سورج ایک لاکھ میل آگے یا پیچھے ہو تو زندگی جل جائے یا منجمد ہو جائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو ارب سال زمین جلتی رہی' اسے ٹھنڈا ہونے میں اربوں سال لگ گئے اور اربوں سال تک یہ

مختلف حوادث سے گزرتی رہی۔ جہاں زندگی کا ابتدائی سراغ تلاش کرنا ایک امر محال ہے۔ انسان کو تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ انسان نے پہلے کیسے سوچنا شروع کیا؟ پہلا سوچ والا دماغ کہاں سے آیا؟ یہاں بھی انسان کی مجبوری ہے کہ وہ مفروضوں پر انحصار کرے۔ یعنی جب بھی علم اپنی حدود سے تجاوز کی جسارت کرے گا' وہ شک و شبہ میں پڑ جائے گا۔ اضطراب اور انتشار میں پڑ جائے گا۔ علم کی دو بنیادی خصوصیات ہیں:

"(۱)۔اپنی ترجیح کا تعین کرنا اور (۲)۔ اپنی حدود کو متعین کرنا۔"

بہترین علم وہ ہے جس کے ہاتھ میں قینچی ہو وہ زائد کو کاٹ دے۔ وہ اس تصور کو کاٹ دے جس کی سمجھنے کی اہلیت ابھی اس میں نہیں ہے۔ اگر آپ اپنی حد سے آگے بڑھتے ہوئے ان سوالوں کا جواب ڈھونڈیں گے جن کا بنیادی Data ہی آپ کے پاس نہیں ہے' جس کی Reading ہی آپ کے پاس موجود نہیں ہے تو آپ ایک بے چین اور مضطرب شخصیت کے مالک ہوں گے۔ جب آپ علم کو اس کی Priority دیتے ہیں۔ جب آپ علم کو اس کا مقصد اولیں دیتے ہیں۔ جب اسے اللہ دیتے ہیں تو وہ بغیر کسی وسوسے و فریب کے اپنی منزل حاصل کر لیتا ہے۔ وہ ہر حال میں اللہ کو پا لیتا ہے۔ اس کی شناخت ہے' جسے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تمام تحقیقات علمیہ اور تمام جسارت فکریہ کا ایک فطری انجام ہے اور وہ اللہ ہے' قرآن حکیم کے الفاظ میں:

"وان الی ربك المنتهیٰ :اور ہر ایک حقیقت کی انتہا تیرا رب ہی ہے!"

وماعلینا الاالبلاغ المبین O

خطبہ سوم

خدااور کائنات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمO

رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطنا نصیراO (۸۰:۱۷)

رب ذوالجلال کی عرفان و معرفت اور علم کی حقیقت کے حوالے سے ایسے پہلو کو زیر بحث لایا جارہا ہے اور میں ایسے مباحث پیش کررہا ہوں جو شاید خدااور کائنات کے بارے میں نہیں کیے گئے۔ رب ذوالجلال اور قرآن برس ہابرس' قرن ہاقرن سے تمام علمائے ظاہر و باطن سے کائنات کے بارے میں بہت آگے رہے۔ اور آج تک ایسا وقت نہیں آیا کہ حضرت انسان کی تحقیق وریسرچ کے باوجود اس کی جستجو پیہم میں کوئی ایسا مقام یامرحلہ آیا ہویا انسان قرآنی معلومات سے آگے بڑھا ہو۔ علم کی ایک نوعیت ایسی بھی ہے جو اسے روایتی علم سے الگ تھلگ کرتی ہے۔ ایک علم وہ ہے' جو خدا کا اپنا ہے۔ اس کی تعلیم اور اس کی Judgment بالکل الگ ہے۔ اس کا معیار اپنا ہے۔ اس اعلیٰ ترین الہیاتی معیار پر کوئی انسان' کوئی بشر اور کوئی مخلوق نہیں پہنچ سکتی۔ اس علم کلی کے عقل انسانی کے دائرہ سے ماورا ہونے کے باوجود پروردگار عالم نے اپنی کچھ رحمت انسان کو عطا کی اور کچھ علم اسے منتقل کیا' جو اسے سمجھنے' اس کی کتاب قرآن کو سمجھنے' اسرار کائنات اور اسرار حیات کو سمجھنے کے لیے ہے۔ ہمارے جو قدیم علماء گزرے ہیں' وہ علم کے متلاشی اور حقائق کے سمندر میں ڈوب کر علم کے موتی نکالنے والے تھے' مگر اب صدیوں سے یہ بدقسمتی ہوگئی ہے کہ آج قرآنی معیار عقل تک پہنچنے والے انسان بہت کم ہوگئے۔ وہ معیار جو اللہ نے قرآن کے فہم کے لیے متعین کیا تھا۔ اس معیار عقل کے حامل اتنے کم ہوگئے کہ گزشتہ تین چار سو برس سے قرآنی آیات کی جو تفاسیر اور وضاحتیں ہوئیں' وہ تمام تر نہ صرف محدود تھیں' بلکہ جملہ علوم سے بھی خالی

تھیں۔ اور تحقیق و جستجو کا وزن ان کے پلڑے میں نہیں تھا۔ اور خدا منتظر تھا کہ شاید کوئی مسلمان پھر سے علم کو مقصد شناخت الٰہیہ بنائے۔ شاید کوئی مسلمان علم برائے علم حاصل کرے۔ مگر بد قسمتی واقع ہوئی کہ مسلمان جو علم کو صرف خدا کے لیے حاصل کرتا تھا یا کم از کم نچلے درجے پر آکر کہیں تو وہ علم کو علم کی خاطر حاصل کرتا تھا' اس نے علم کو سوائے بدن کی ضرورت کے اور کہیں نہیں پہنچایا۔ حالانکہ حصول علم کے مقصد کے اس تغیر و تبدل نے ہی اس کی تاثیر کی سمت کو بدل دیا:

علم را بردل زنی یارے بود
علم را برتن زنی مارے بود

(رومی)

جب علم کو آپ تسکین قلبی کے لیے' شناخت حیات کے لیے استعمال کرتے ہیں' تو یہ آپ کو غیر معمولی اور معجزہ آفریں علیت دیتا ہے۔ مگر جب علم کا حصول تمام تر بدن ہی کے لیے ہوگا' ضروریات زندگی کے لیے ہوگا یا محض ذاتی اغراض و مقاصد کے لیے ہوگا تو وہ علم کبھی بھی فہم قرآن کی سطح تک نہیں پہنچ سکتا' جو اللہ کو اس کائنات کو اور اس کائنات کے اغراض و مقاصد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

کائنات کی شناخت کے موضوع کو زماں و مکاں کے تصور سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں ایسی حقیقتیں ہیں کہ ان کو ہم ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ اگرچہ آج اضافیت اور کوانٹم پر سوچنے والے بہت سے مفکرین اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ماورائے کائنات کچھ ایسے اصول دریافت کریں' جن سے فہم کائنات آسان ہو جائے۔ مگر اس سے پہلے ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا انسان کے لیے کائنات کی تسخیر مقدر ہے؟ کیا انسان نے اس کائنات کو مسخر کرنا ہے؟ یا اس کائنات کو اور اس کی تحقیق کو انسان کے لیے صرف شناخت کا ایک آلہ بنایا گیا ہے۔ گویا اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم اس جستجو و تحقیق سے کام لے کر بڑے تھوڑے سے عرصے میں اپنے رب کائنات سے آگاہی حاصل کرلیں۔ اس کے لیے ہمیں اس نکتہ آغاز کی طرف متوجہ ہونا ہوگا' جب رب ذوالجلال نے حضرت آدمؑ کی شکل میں پہلے انسان کو اس کرۂ ارض پر آباد کیا اور انسان کو اس کرۂ ارض پر اتارتے ہی ارشاد فرمایا:

ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین. (۳۶:۲)

ترجمہ: ”تمہارے لیے زمین میں تھوڑا سا ٹھہرنا ہے اور ایک مقررہ وقت تک کے لیے فائدہ ہے۔“

یہاں رب ذوالجلال نے مستقر فرمایا کہ یہ کرۂ ارضی انسان کے لیے کوئی مستقل جائے قیام نہیں ہے' بلکہ یہاں اس نے تھوڑا سا ٹھہرنا ہے۔ گویا انسان کی زندگی اتنی مختصر ہے کہ اگر اس کی Continuity کو وسیع تر کائنات کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس کی کوئی بھی Average نہیں بنتی۔ کیونکہ اس کائنات کا چوتھا دور 60 کروڑ سالوں سے اوپر شروع ہوتا ہے۔ گنتی میں تمام مروجہ آلات پیمائش معطل ہو جاتے ہیں۔ وہ کائنات جو ارب ہا ارب نوری سالوں کے فاصلوں تک پھیلی ہوئی ہے' جبکہ نوری سال کا ایک سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ سے شروع ہوتا ہے۔ اس طرح تو اتنی بڑی کائنات کو جاننے' پرکھنے کے لیے وہ عمر جو بیس سال تک اپنی آگہی حیات ہی حاصل نہیں کرتی اور جس کے آخری بیس سال بھی نذر تغافل ہو جاتے ہیں' اس مختصر سی عمر میں کائنات کی کتنی تسخیر ممکن ہے؟ مگر اس کے لیے انسان کو عقل و معرفت کا پیمانہ اور آلہ عطا کیا گیا ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ رب ذوالجلال کی جستجو میں کائنات میں غور و فکر کرنا کام آئے گا۔ ارشاد فرمایا:

الذین یذکرون اللّٰہ قیاما وقعودا وعلی جنوبھم ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ماخلقت ھذا باطلا سبحنک فقنا عذاب النار o (۱۹۱:۳)

ترجمہ: (اہل ایمان وہ لوگ ہیں) جو اللہ کو یاد کرتے ہیں' کھڑے' بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق میں غور کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

اس آیت سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق پر غور کیا جائے اور غور و خوض اس لیے ہو کہ یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ اس زمین و آسمان کا کوئی خالق ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہی اعزاز بخشا گیا۔ وہ ایک ایسی دنیا میں پیدا ہوئے' جہاں ستارے خدا تھے' جہاں علم نجوم کو آخری علم کا درجہ حاصل تھا' جہاں سیدنا ابراہیمؑ نے غور و فکر کے ذریعے لاالٰہ سے الا اللہ تک رسائی حاصل کی۔ نجوم و سموات اور شمس و قمر کو خدا ماننے کے بجائے ان کے خالق کو خدا مانا اور بالآخر A Priority Method سے وہ اپنے اللہ کو جاننے میں کامیاب ہو گئے۔ (القرآن۔ ۷۵:۶ تا ۷۹)

اگر ہم جستجو خداوند اور معرفت کائنات کے حوالے سے حضرت ابراہیمؑ کو دیکھیں تو حضرت ابراہیمؑ نے کوئی نیا Cosmic Thesis نہیں دیا۔ وہ تحصیل علوم میں یا Cosmology میں کوئی بڑا نام نہیں سمجھے گئے، مگر اللہ کو جاننے میں وہ اتنے بڑے انسان سمجھے گئے، مقصد کائنات اور معرفت کائنات کے باب میں وہ اتنی بلند مرتبہ شخصیت سمجھے گئے کہ پروردگار عالم نے ارشاد فرمایا:

قال انی جاعلك للناس اماما (۲:۱۲۴)

ترجمہ: فرمایا اے ابراہیمؑ (تیری اس جستجو، تیری اس تحقیق، تیرے اس خلوص کے عوض) ہم نے تمہیں جملہ انسانوں کا امام مقرر کیا۔

کائنات کی تخلیق میں غور و فکر اور آج کا فکری ارتقا ہمیں کس حد تک معرفت خداوندی عطا کر سکتا ہے، اس کے لیے ہمیں آج کی Cosmology میں ہونے والی علمی و تحقیقی ترقی کو دیکھنا ہوگا۔ آج کی Cosmology اور علم اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ تمام کائنات شروع میں چند Gases کا (ہیلیم اور ہائیڈروجن کے mixup کا) مجموعہ تھی۔ یہ بڑے بادلوں کی شکل میں تھے۔ ان بادلوں نے سکڑنا شروع کیا، خشک ہونا شروع کیا اور اس طرح اس Solidity کے نتیجے میں تخلیق کائنات شروع ہوئی۔ اگر اس حقیقت کو ہم قرآن و حدیث کی روشنی میں پرکھنا چاہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اللہ زمین و آسمان بنانے سے پہلے کہاں تھا تو فرمایا: دھند میں تھا، دخان میں تھا۔ اب قرآن حکیم کی طرف آتے ہیں:

ثم استویٰ الی السمآء وھی دخان فقال لھا وللارض ائتیا طوعا وکرھا قالتا اتینا طائعین. (۴۱:۱۱)

ترجمہ: پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہو۔ اور یہ دھواں تھا۔ تو اللہ نے اسے اور زمین کو کہا کہ دونوں برضا یا بغیر رضا کے اطاعت کرو۔ تو ان دونوں نے کہا ہم بخوشی اطاعت کرتے ہیں۔

یہی دخان، بادل، شہابیے اور Siddin اور Gasous Volumes اب بھی موجود ہیں۔ جن سے اس کائنات کا آغاز ہوا۔ اگر آج کے علمی (Scholars) اس انوکھی حقیقت کو جان کر پریشان اور شرمسار نہ ہو جائیں، تخلیق کائنات کے ہی عمل کو رب ذوالجلال نے یوں بیان کیا:

اولم یرالذین کفروا ان السموات والارض کانتا رتقا ففتقنهما وجعلنا من الماء کل شئی حی افلایومنون. (۲۱:۳۰)

ترجمہ: کیا کافر لوگ نہیں دیکھتے کہ بے شک آسمان و زمین اکٹھے تھے۔ پھر ہم نے انہیں پھاڑ کر الگ کیا۔ اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ کیا وہ ایمان نہیں لاتے؟

مگر چونکہ آج سے ایک ہزار سال پہلے اس قسم کا کوئی بھی Roman 'Thesis Methodological Sciences میں موجود نہ تھا' Greek Methodological Sciences میں موجود نہ تھا۔ Asil اور Babalonians میں موجود نہیں تھا' Mesopotonuous میں موجود نہیں تھا۔ Aevinious میں موجود نہ تھا۔ اس لیے جب یہ علمی روایت آج کے عالم تک پہنچی تو وہ اس امر پر مجبور تھا کہ وہ الفاظ قرآن کو سادہ ترین معانی میں بدلے۔ مگر یہ امر باعث حیرت ہے کہ اصحاب رسولؐ نے کوئی ایسی غلطی نہیں کی۔ جس طرح ہمارے ادوار کے مترجمین نے کیا۔ جس طرح شاہ رفیع الدین نے دخان کا ترجمہ کیا کہ بلند ہوا آسمان کو اور وہ دھواں تھا۔ دھواں لفظ دخان کا ترجمہ نہیں ہے۔ شاہ رفیع الدین بہت اچھے مترجم ہیں' مگر ان کو شاید اس کا equivalent اردو لفظ نہیں مل سکا۔ پھر اس ترجمہ کو نواب وحید الزمان نے دہرایا کہ بلند وہ آسمان کو اور وہ دھواں سا تھا۔ اس طرح یہ ترجمہ پہلے سے بھی زیادہ اصل سے دور ہو گیا۔ اس پر تو اشتباہ عمومی پڑ گیا کہ وہ دھواں سا تھا' حالانکہ قرآن کہہ رہا ہے "وھی دخان" اور قرآن نے کسی قسم کا ابہام نہیں چھوڑا۔ دخان کی وضاحت میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا:

"دخان سے مراد ایسا دھواں ہے' جس میں پانی ملا ہو۔ یعنی بخارات والا۔ یہ وہ لفظ ہے جو Moisturised گیسوں کے معنی پر پورا اترتا ہے۔ یہ گیسیں وہ بنیادی مواد ہیں' جس سے یہ کائنات وجود میں آئی۔ خدا اور اس کا رسولؐ اس مواد کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اس طرح آج کی تحقیقات کو خدا کے قریب پہنچنے کے لیے مزید سفر طے کرنا ہے۔ کیونکہ جب تک پورے قرآن کی حقانیت ثابت نہیں ہو جاتی' جب تک آیات قرآنی میں ایک بھی اشتباہ موجود ہے' اس وقت تک اللہ تعالیٰ اس دنیا میں تحقیق و جستجو کے دامن کو تنگ نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ قرآن ہر حال میں اپنی حقانیت کو پورا کرے گا اور اللہ ہر حال میں اپنی سچائی کو پورا کرے گا' چاہے اس کی جستجو کا سفر مسلمان کریں یا کافر۔

مندرجہ بالا آیات کریمہ میں پروردگار عالم نے بالکل واضح طور پر قرآن حکیم میں

بیان فرمایاہے کہ ہم آسمانوں کو بلند ہوئے اور یہ بھی ہے کہ زمین و آسمان پہلے اکٹھے تھے اور ہم نے ان کو ایک بہت بڑے دھماکے سے ایک دوسرے سے جدا کیا۔ اس طرح کسی چیز کو پھاڑ کر جدا کرنا آسان نہیں ہوتا' بلکہ یہ صرف پروردگار عالم ہی کی قدرت کاملہ کے تحت ظہورپذیر ہو سکتا ہے۔ اسے آج Big Bang تصور کیا جاتا ہے۔ جس پر سب متفق ہیں۔ اور اس کی جزئیات کو آج کی سائنس بھی ثابت کر رہی ہے۔ جو آگے بڑھتے ہوئے مزید دھماکوں کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ اگر ہم اس آیت کریمہ کی تفہیم کے لیے مزید غور وفکر کرتے ہیں کہ ایک Huge Mass ہے' جو دامن سے' باطن سے پھٹ کر جدا ہو رہا ہے اور اس کائنات کے آسمان وزمین تخلیق ہو رہے ہیں' تو پھر اسی Universal Creation کے بارے میں اشتباہ نہ رہتا۔

تخلیق کائنات کے حوالے سے یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ جب پروردگار عالم آسمان بنانے کی بات کرتا ہے تو سات آسمانوں کی بات کرتا ہے اور سات زمینوں کی بات کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اللہ الذی خلق سبع السموات ومن الارض مثلھن۔ یتنزل الامر بینھن لتعملوا ان اللہ علی کل شیءٍ قدیر وان اللہ قداحاط بکل شیءٍ علما O (۱۲:۶۵)

ترجمہ: اللہ تو وہ ہے' جس نے سات آسمان پیدا کیے۔ اور سات زمینیں اس کی طرح کی ان کے درمیان اس کا امر اترتا ہے تاکہ تم جان لو کہ بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اور بے شک اللہ نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے (اپنے) علم کے ساتھ۔

یعنی اس کائنات کے مابین کوئی زمین ایسی نہیں کہ جہاں حیات کا کوئی بیج نہیں اگتا۔ اور قانون خداوند نہیں اترتا۔ باوجود اس کے کہ آج تمام سائنسی حقائق متعدد اور ان گنت شمسی وجودوں کی طرف جا رہے ہیں اور اسی قسم کی جیسی ہماری Constellations ہیں۔ ہماری کہکشاؤں جیسے بے شمار سورجوں کا وجود ہے۔ جن کی طرف سائنس نشاندہی کر رہی ہے۔ مگر اس وقت تک سائنس اس یونیورس میں کسی دوسری حیات کا سراغ نہیں ڈھونڈ سکی اور دنیا میں زندگی کا ظہور دریافت نہیں ہو سکا (ماسوائے زمین کے)۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سبع سموات سے مراد اللہ نے ایک کائنات نہ لی ہو۔ ہم لوگوں کی محدود عقل و معرفت اللہ کی کائنات کو صرف ہمارے سامنے کی کائنات تک ہی محدود کرتی ہے' جبکہ سبع سموات سے مراد ایسی ہی کئی کائناتیں ہیں۔ ہمیں ہماری ایک کائنات جس کی گہرائیوں' پنہائیوں اور اتھاہ

قوتوں کو سمجھنے میں انسان ابھی تک ابتداحال سے بھی فارغ نہیں ہوا۔

یہاں سبع سموات سے سات کائناتوں کا استنباط اپنے ظاہری خیال سے نہیں کیا جارہا بلکہ یہ تصور براہ راست قرآن حکیم کی آیات سے لیا جارہا ہے۔ پروردگار عالم نے جب آسمان دنیا کا تذکرہ کیا تو فرمایا:

انا زینا السماء الدنیا بزینة الکواکب ○ (۳۷:۶)

ترجمہ: بے شک ہم نے آسمان دنیا کو تاروں سے سجایا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

واوحیٰ فی کل سماء امرھا وزینا السماء الدنیا بمصابیح (۴۱:۱۲)

ترجمہ: اور (ہم نے) ہر آسمان میں اپنا حکم نازل کیا اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے سجایا۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ چراغ اللہ تعالیٰ نے سورج کو کہا:

وجعل القمر فیھن نورا وجعل الشمس سراجا (۷۱:۱۶)

ترجمہ: اور ہم نے ان میں چاند کو روشن اور سورج کو دمکتا ہوا چراغ بنایا۔

آسمان کی بات کرتے ہوئے پروردگار عالم نے سماوات یعنی جمع کا صیغہ استعمال کیا۔ اور پھر آسمان دنیا کا الگ سے تذکرہ فرمایا کہ اسے چراغوں سے سجایا گیا۔ اگر ہم اپنی ایک کھرب یا دو کھرب کے قریب کہکشانی وسعتوں کو دیکھیں تو ان میں ہمیں بے پناہ ارب ہا ارب جو سورج نظر آتے ہیں۔ یہ آسمان دنیا کے چراغ ہیں۔ قرآن حکیم نے جلتے ہوئے چراغ اور روشن شدہ چراغ کہتا ہے اور چاند کو منور شدہ۔ قرآن حکیم میں ایک آیت میں بھی چاند کو از خود روشن نہیں کیا گیا۔ اگر اللہ کے وجود کا کوئی اور ثبوت نہ ہوتا تو بھی یہی ایک حقیقت کہ پندرہ سو سال قبل قرآن حکیم نے سورج اور چاند کے اس فرق کو بیان کر دیا' انسان کو اللہ کی موجودگی اور اس کے وجود کا یقین دلانے کے لیے کافی ہے۔ جس طرح جوش ملیح آبادی نے کہا کہ ہم جیسے اہل یقین کو نبوت حق کے لیے اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح ہی کافی تھی۔ یہ کائنات جو اپنے خالق کے وجود کی دلیل ناطق ہے۔ اپنی وسعتوں کے لحاظ سے صرف ان سات آسمانوں' زمینوں اور ان سات Universes تک ہی محدود نہیں' بلکہ اس کے بارے میں قرآن حکیم کی کہی ہوئی بات بڑی Different سی ہے۔ قرآن حکیم اور حدیث نبویؐ اس وسعت کو ایک ہی طرح بیان کرتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

وسارعواالی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضھا السموات والارض اعدت للمتقین O (۳:۱۳۳)

ترجمہ: اور اپنے رب کی مغفرت کے حصول کے لیے جدوجہد کرو اور اس جنت کے لیے کہ جس کی چوڑائی میں آسمان وزمین آجائیں' جو متقین کے لیے تیار کی گئی ہے۔

سابقوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضھا کعرض السماء والارض. (۵۷:۲۱)

ترجمہ: اپنے رب کی مغفرت کے لیے (ایک دوسرے سے) آگے بڑھو اور جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان وزمین کی چوڑائی کی طرح ہے۔

کائنات کی یہ وسعت ادراک میں نہیں آسکتی۔ یہ کسی دنیاوی پیمانہ یا انسانی فکر کے پیمانہ سے شمار نہیں کی جاسکتی۔ ابھی تک کوئی ایسا کمپیوٹر بھی نہیں ملا' جو وسعت افلاک کو پوری طرح ذہن میں لاسکے۔ چہ جائیکہ اس جنت کو جس کی چوڑائی میں زمینوں اور آسمانوں کی وسعتیں وبلندیاں آجائیں۔

کسی نے حضور گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اگر جنت اتنی بڑی ہے تو یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوزخ کہاں ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ جب دن طلوع ہوتا ہے تو رات کہاں جاتی ہے؟ اگر بظاہر دیکھیں تو سوال وجواب میں کوئی مناسبت نہیں دکھتی۔ کہ سوال میں تو Space کا تذکرہ ہے' اس کی وضاحت کے لیے Space ہی سے مثال دی جاسکتی ہے۔ جیسے اس طرح کہ ہال اتنا ہی بڑا ہے جتنا بڑا باہر کا میدان۔ یعنی ان میں کوئی مماثلت ہونی چاہئے۔ مگر یہ کہنا کہ ہال اتنا بڑا ہے جتنی بڑی وہ روشنی ہے تو یہ عجیب لگتا ہے۔ مگر اس عدم مناسبت کے پیچھے آپؐ کے جواب میں ایک بڑی عجیب وغریب حکمت کارفرما ہے۔ اللہ کے رسولؐ کی یہ بات Highly Intellectual Patterns کشادہ کرتی ہے۔ اور اس سے عقل وفہم اور حیرت واستعجاب کے نئے باب کھلتے ہیں۔ کہ جس نبی کو لوگ سادہ فہم' امی اور مطلق کم تعلیم یافتہ پیغمبر گردانتے ہیں' کیا آپؐ کے سوا کوئی اور اس طرح بات کرسکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ آپؐ کے اس جواب سے بڑھ کر اس حوالے سے عقل کی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ ذرا اس بلیغ ارشاد کو دیکھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دن اور رات تو سورج کے محتاج ہیں۔ ایک ہی سورج' جس حصہ زمین کو منور کرتا ہے وہاں دن ہے اور دوسرے میں رات ہوتی ہے۔ تو حضور گرامی مرتبت ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ

پروردگار کا جمال جہاں آفریں جدھر رخ کرے گا وہ جنت ہوگی اور جدھر سے اس کے چہرۂ مبارک کا اعراض ہوگا وہ دوزخ! اگر قرآن حکیم کو دیکھیں تو یہ حقیقت قرآن بیان کرتا ہے کہ جنت والے دوزخ والوں کو اوپر سے دیکھیں گے اور کہیں گے کاش! تمہارے اعمال اچھے ہوتے تو تم بھی ہماری طرح اس خوبصورت جگہ ہوتے اور جنت و دوزخ کے درمیان بھی ایک جگہ ہے' جسے اعراف کہتے ہیں۔ اعراف والے نیچے دیکھ کر خدا کے خوف کا اظہار کریں گے اور اوپر دیکھ کر آرزو کیا کریں گے کہ پروردگار ہمیں کبھی تو اگر معاف کردے' بخش دے تو ہم بھی تیری جنت میں داخل ہو سکیں۔

رب ذوالجلال نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے خود کو ذی المعارج (۷۰:۳) فرمایا۔ مگر ذی المعارج کی حقیقت تاحال آج کی Sciences کے ادراک میں نہیں آسکی۔ اس حوالے سے میرا ہمیشہ سے خیال تھا کہ کائنات بالا میں ایسے کچھ چور دروازے ضرور ہیں' جہاں سے ہم رب ذوالجلال تک رسائی پا سکتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اتنی وسعتوں کو محدود کرنے والی کوئی لازمانی اور لامکانی معارج (Corridor) ضرور موجود ہے۔ جہاں سے انسان جھانکتا ہو اور اپنے پروردگار پر نگاہ ڈال سکتا ہو۔ جب ایک موقع پر امریکہ کے کچھ ریاضی اور کوانٹم کے ماہر اساتذہ اور پروفیسرز سے میری گفتگو ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ:

"This is strange they didn`t call it corridor but a few ladders, timeless and spaceless ladders, to which the latest quantum has been able to discover."

اب ایسی سیڑھیاں دیکھی گئی ہیں اور ایسی Tragectories دریافت ہوئی ہیں' جو کروڑوں میل کا فاصلہ منٹوں میں ختم کردیں۔ اس نے خصوصاً Saturn سے Earth کے فاصلے کا تذکرہ کیا۔ اگر ہم کسی ایسی Tragectory میں داخل ہو جائیں تو یہ فاصلہ دو سے آٹھ منٹ میں طے ہو سکتا ہے۔ ابھی سائنس دان ان نتائج کو عام نہیں کر رہے۔ تاہم ان لوگوں کی تحقیق و جستجو سے ہمیں یہ بات سمجھنے میں مدد ملی کہ رب ذوالجلال نے خود کو ذی المعارج کیوں کہا؟ اسی طرح جدید سائنس کی تحقیقات اس امر کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں کہ جب رب ذوالجلال نے دن اور رات کے بدلنے کا تذکرہ کیا اور اس کے لیے "لپیٹ لینے" کے الفاظ استعمال کیے تو اس کا مفہوم کیا ہے؟ ارشاد ربانی ہے:

خلق السموات والارض بالحق یکورالیل علی النهار ویکورالنهار علی الیل وسخرالشمس والقمر. (۵:۳۹)

ترجمہ: ''اس نے آسمان اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا وہ دن کو رات سے اور رات کو دن سے ڈھانپ دیتا ہے۔ اور اس نے سورج و چاند مسخر کیے۔''

قیامت کی نشاندہی کرنے والا رب کریم اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ اس نے انسان کو کتنا علم دینا ہے اور کس خاطر دینا ہے۔ انسان نے کتنی ترقی کرنی ہے اور کس قدر آگے بڑھ کر خدائی دعوؤں کو چیلنج کرنا ہے۔ مگر بدقسمتی سے آج کا انسان ستاروں کی گزرگاہوں کا مسافر ہونے کے باوجود اپنی زندگی کی شب تاریک کو سحر نہیں کر سکا۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اتنی تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے انسان کی تحقیقات بالآخر عرصہ زماں تک آ کر رک جاتی ہیں اور بغیر اذن پروردگار، کوئی نیا نکتہ، کوئی نئی تحقیق انسان کو نہیں بخشی جاتی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر نئی تحقیق مغرب ہی کو کیوں سونپی جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حکمت کے جن معانی کو قرآن نے استعمال کیا ہے ان کے لیے مسلم و غیر مسلم کی کوئی قدغن نہیں لگائی:

یوتی الحکمة من یشاء ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا. وما یتذکر الااولوالالباب. (۲۶۹:۳)

ترجمہ: اللہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا کی گئی اسے خیر کثیر عطا کی گئی اور نصیحت تو اہل عقل لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔

اسی طرح رب ذوالجلال اولاد آدمؑ کی کرامت و عزت کی بات کرتا ہے:

ولقد کرمنا بنی آدم وحملنهم فی البر والبحر. (۷۰:۱۷)

ترجمہ: اور تحقیق ہم نے بنی آدمؑ کو عزت عطا کی اور انہیں خشکی و سمندروں میں اعلیٰ مقام عطا کیا۔

اس بنی آدمؑ میں مسلمان و غیر مسلم سبھی شامل ہیں۔ اس میں ایک فرق ضرور ہے کہ

اہل مغرب اپنے مقاصد کو سنجیدگی سے لیتے ہیں اور اپنی تحقیق و جستجو کے لیے اپنی عمر کا ایک حصہ تج دیتے ہیں۔ تاہم وہاں ہمیں علم برائے خدا نظر نہیں آتا۔ مگر علم برائے علم ضرور نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے خدا نے انہیں خصوصی حکمتوں سے نوازا اور ہمارے ہاں جسے میں نے اپنی بدقسمتی کہا علم برائے علم بھی نظر نہیں آتا۔ اور علم برائے خدا تو بالکل ہی مفقود ہے۔ اور وہ لوگ جو خدا کے نام اور اس کی نشاندہی کرنے والے ہیں' بدقسمتی سے وہ لوگ سب سے زیادہ کم علم واقع ہوتے ہیں۔ جب وہ خدا کی صفت علمیہ سے متعارف نہیں ہوتے' حالانکہ اللہ کے نزدیک تمام درجات انسانی علم پر ہیں:

والذین اوتو االعلم درجت. (۱۱:۵۸)

ترجمہ: اور وہ لوگ جو علم والے ہیں' ان کے درجات اللہ بلند فرماتا ہے۔

اور یہ کہ:

نرفع درجت من نشاء وفوق کل ذی علم علیم. (۷۶:۱۲)

ترجمہ: ہم جس کے درجات چاہیں بلند کرتے ہیں اور ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے۔

خداوند کریم بار بار اور مسلسل آپ سے یہ کہہ رہا ہے کہ میرے نزدیک ظاہری عبادات کے درجے نہیں ہیں۔ وہ درجے جو آپ ظاہری عبادات کے ذریعے حاصل کرتے ہیں ان کا معاوضہ جنت ہے' ان کا معاوضہ آرام و سکون ہے۔ ان کا معاوضہ آپ کو دنیا میں بھی ملے گا۔ مگر میری شناخت' میری آگہی اور میرا دیدار کہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے' جب تک آپ درجات علمیہ میں ترقی نہ کریں گے۔ جب تک آگہی اور شعور حاصل نہ کریں گے۔ جب تک آپ کمال عرفان نفس اور علم نفس حاصل نہ کریں گے۔ مگر دیکھیئے تو سہی ہم کمال عرفان نفس کے متعلم ہوتے ہوئے بھی تعلیمات نفیسہ کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں جانتے اور یورپ کو دیکھئے' سائیکالوجی' پیرا سائیکالوجی' کلینکل سائیکالوجی' اخلاقی نفسیات کی صورت میں انہوں نے علوم نفیسہ کی مہارت میں کیا کچھ فروغ دے دیا۔ علم کے ساتھ اور اس آج کی جدید علمی و سائنسی تحقیقات کے ساتھ جس کی کچھ وضاحت عرض کی گئی آج مشاہدہ حق کی گفتگو ہو سکی ہے' بقول غالب:

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو!
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اسی طرح کچھ تصورات کے بغیر شاید کائنات ہماری سمجھ میں بھی نہ آسکے۔ مگر یہ تصورات کہ فلسفیانہ ہیں نہ ریاضیاتی بلکہ بنیادی طور پر یہ وہ تصورات ہیں' جو انسانی ذہن کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایک طرف تو ایک عام انسان اپنے خیالات کی دنیا میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے اور دوسری طرف دنیائے ذہن کا جو بلند ترین ذہنی استعداد کا حامل ہے' وہ اپنے خیالات سے نکلتا ہے' جنہیں ہم زماں و مکاں کے تصورات کہتے ہیں۔ زماں و مکاں پر غور و فکر انسان کا بنیادی وصف ہے' ہر ذہین آدمی کہیں نہ کہیں ان تصورات پر ضرور غور کرتا ہے۔ اگرچہ یہ موضوع بہت طویل ہے اور ''زمانہ'' ہی اسے محدود کر سکتا ہے:

نہیں ہے جو ہے نہ ہو گا یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

(اقبالؒ)

تاہم چند بنیادی فلسفی افکار کے مطابق تصور زماں و مکاں کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ وہ لوگ جو زمانے کو غیر متغیر اور ابدی سمجھتے ہیں مثلاً زینو (Zeno, the Stoic of Elia) اور پیرامینڈس (PARMENIDES)۔ انہوں نے زمانے کو غیر متحرک سمجھا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ زمانہ میں کوئی حرکت نہیں ہے۔ بلکہ حرکت جو ہے سراب تخیل ہے۔ دراصل یہ ایک سکوت مستقل ہے۔ یہ ایک لاتناعی امر استقلال ہے اس میں کوئی حرکت نہیں ہے۔ جیسے ایک تیر فضاؤں سے گزرتا ہوا بظاہر لگتا ہے کہ وہ کوئی فاصلہ طے کر رہا ہے مگر زینو کہتا ہے ایسا نہیں ہے۔ جب زمانے کو تقسیم کیا جائے تو تیر کہیں نہ کہیں کسی زمانے کے حصے میں ساکت ہو گا۔ دراصل یہ سکوت ہے تغیر نہیں ہے۔ مگر بہت سے لوگ ایسے آئے جنہوں نے زینو اور پارمینڈیز کے ان خیالات کے خلاف کیا۔ کچھ لوگ زمانے کو قطعاً حقیقی نہیں سمجھتے کہ زمانہ ایک سراب' ایک خیال یا ایک تصور ہے۔ ایک وہم ہے' ایک سہولت ہے جسے انسان نے اپنے معاملات کو سرانجام دینے کے لیے متعین کیا ہے۔ ان میں سے لائبنز (Leibniz) کہتا ہے کہ زمانہ کوئی حقیقی شے نہیں بلکہ ایک اضافت مسلسل ہے۔ ایک Relativity ہے۔ ایک کام کو دوسرے کام سے جدا کرنے کے لیے ہم زمانے کا نام لیتے ہیں۔ اگر کام جدا نہ ہوں تو زمانہ بھی نہیں ہے۔ جو کاموں میں فراغت اور فرق ڈالتا ہے اس کو از خود ہم زمانہ کہتے ہیں۔ حالات و واقعات کو اوقات میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

ان تصورات میں سائنسی جبریت (Scientific Determinism) زمانے کو اور

مکاں کو کسی اور صورت سے دیکھتا ہے۔ ہمارے نظریہ جبر و قدر کے سب سے زیادہ قریب یہی ہے۔ بلکہ ایسے لگتا ہے کہ اس مغربی فکر نے مقدر کو زیادہ بہتر سمجھ لیا ہے۔ وہ کہتا ہے جبر یہ ہے کہ اللہ نے زمانے کے ایک لمحے کو ایک مقام دنیا سے جوڑ رکھا ہے اور جوڑنے والا جبار کہلاتا ہے۔ تو اللہ کا بنیادی کام یہ ہے کہ اگر وہ زمانے کو مکاں سے نہ جوڑتا تو دنیا میں کوئی کام درست طور پر نہ ہو سکتا تھا۔ کسی قسم کا کوئی واقعہ وجود میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس لیے کہ اس صورت میں اپنے اپنے مقام پر کبھی تو نہیں، کبھی ہم نہیں کا سا حال پیدا ہو جاتا۔ کہیں زمانہ خوف ہو جاتا تو کہیں مکاں۔ اس طرح زماں کے اندر کوئی ربط و مطابقت باہمی نہ رہتی۔ نہ پتا لگتا کہ بچے کب پیدا ہونے ہیں، نہ پتا چلتا کہ جاب پر کب جانا ہے، زندگی کب پیدا ہو رہی ہے، موت کب آ رہی ہے؟ تو پروردگار نے انسانی زندگی کے ضبط کے لیے، پروٹوکول کے لیے، زندگی کو آسان کرنا کے لیے حفاظتی تدابیر کے طور پر زماں اور مکاں کو اس طرح جوڑ رکھا ہے کہ ہم اس میں اپنی اپنی ساعتوں سے گزر کر اپنے اپنے مقام (مکاں) کے فوائد حاصل کر رہے ہیں۔

گویا لائبنیز حقیقت کو تجربہ سمجھتا ہے۔ زمانے کو ایک تجربہ سمجھتا ہے۔ ایک وہم و گماں اور خیال تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح وہ ماضی، حال اور مستقبل کو اضافتیں سمجھتا ہے۔ وہ اسے کوئی تسلسل قرار نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ بغیر ان کے زمانے کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ حال مستقبل کی صورت میں ہماری تخلیقات اور ہماری تقسیمات ہیں۔ یہی زمانے کو معانی دیتی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو زمانہ، جو ایک تسلسل رواں و پیہم ہے، اس کی سمجھ نہیں آ سکتی۔ وہ حال، مستقبل اور ماضی سے زمانے کے وجود کو سمجھتا ہے کہ زمانہ بحیثیت خود کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اگر آپ یہ کہیں کہ زمانہ الٹتا پلٹتا ہے، زمانہ بدلتا ہے تو اس چیز کا کوئی وجود نہیں ہے۔ صرف ہم نے جو مکانی تقسیم کی ہوئی ہے، ہم نے جو ماضی، حال اور مستقبل کا تعین کیا ہوا ہے اس لیے ہم زمانے کو ان سے منسوب کر دیتے ہیں اور زمانے کو ایک منفرد اکائی بنا دیتے ہیں۔ ارسطو اور ابن اشد نے کہا ہم واپس جا رہے ہیں، کیونکہ یہ نیا زمانہ ہے اور اس میں نئے تصورات شروع ہونے والے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ زمانہ حرکت سے ہے۔ زمانے کو حرکت پر تقدم حاصل نہیں ہے۔ حرکت زمانے میں موجود ہے اور سکون تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر زمانہ حرکت پر غالب ہے اور ایک بڑا وجود رکھتا ہے۔ حرکت اس کا جزو ہے۔ حرکت زمانے کا کوئی مستقل اور مقدر حصہ نہیں ہے۔ لارڈ رسل کو کون نہیں جانتا۔ دور حاضر کا یہ عظیم فلسفی ز. نے کو

فریب قرار نہیں دیتا۔ اسی طرح وہ تغیر و حرکت اور زماں و مکاں کو فریب نہیں سمجھتا' بلکہ ان سارے تصورات کو حقیقت قرار دیتا ہے۔ جو ریاضیاتی حدوں کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے وہ اس میں ریاضیاتی عنصر کو شامل کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ریاضی کے طریق کار میں جو چیزیں آجاتی ہیں وہ فریب نظر نہیں ہو سکتیں' وہ حقیقی ہیں۔ اس لیے وہ زمانے اور تغیر کو حقیقی سمجھتا ہے۔ اقبال نے شاید اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ؎

تو چشم بستی و گفتی کہ ایں جہاں خواب است!
کشائے چشم کہ ایں خواب خواب بیداری است

(زبور عجم)

اگر تو آنکھ بند کرلے گا تو یہ سارا تصور تجھے خواب نظر آئے گا۔ مگر جب تو آنکھ کھولے گا تو یہ خواب تجھے خواب بیداری نظر آئے گا۔ آئن سٹائن کا تصور تمام تر اضافی تاثرات کے گرد گھومتا ہے۔ وہ زمان و مکاں کو باہم اضافی حقیقت تصور کرتا ہے۔ جب اس کے ہاں سہ جہتی مکاں اور یک جہتی زماں ملتے ہیں' تو یہ ہمارے لیے بھی اضافی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے بھی اضافی تاثرات ہی پیدا کرتے ہیں۔ مگر اس کی وضاحتیں تاحال نہیں آسکیں۔ اس حوالے سے جو آخری تحقیق موجود ہے' میں اس پر گفتگو کر رہا ہوں۔ جب ستاروں کی حرکت کو دیکھا گیا تو چار سمتوں سے ہٹ کر کچھ اور بھی دریافت ہو چکی ہیں۔ یعنی اب چہار سمتی تصور کی یکجائی ٹوٹ رہی ہے۔ اور شاید اگلے دو' تین برس میں مطلقاً ہی ٹوٹ جائے اور اب خیال کیا جاتا ہے کہ کثیر الجہاتی کائنات میں صرف تین' چار جہات (Dimensions) ہی نہیں ہیں' بلکہ زمانہ کی اور بھی کئی جہات ہیں۔ بقول اقبال ؎

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور بھی زمانے ہیں کئی جن کا نہیں کوئی نام

(بال جبریل)

آج مغرب میں اس حوالے سے جو جدید ترین تحقیقات ہو رہی ہیں' وہ باعث حیرت و استعجاب ہے۔ شاید آنے والے زمانے میں مطالعہ کائنات میں بے شمار جہات کا وجود انسان کے لیے ایک دردسر بن جائے گا۔

بڑی پرانی بات ہے۔ ہراقلیتوس (Heraclitus) نے کہا تھا:

"You can not step twice into the same river because other

waters are ever flowing on."

کہ ہم ایک دریا سے دوبار نہیں گزرتے۔ ایک لہر جو دریا سے گزر جائے دوبارہ وہاں نہیں پلٹتی۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ زمانہ متحرک ہے اور ہمیں ایک زمانے کا دو مرتبہ ادراک نہیں ہو سکتا۔ برگساں نے 1809ء اور 1914ء کے درمیان زمانے کے دوراں (Duration) کو بڑی اہمیت دی اور اسے ہی حقیقت بتایا۔ وہ سب چیزوں کو فریب تصور کرتا ہے۔ وہ جسم اور مکانی حیثیت کو فریب قرار دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ "دوراں" کو ہی دوام حاصل ہے۔ دوران زمانہ ہی اہمیت کا حامل اور حتمی ہے اس لیے جب اسے اقبال نے یہ حدیث رسولؐ سنائی:

لاتسبوا الدهر ان الدهر هو الله. (حدیث)

ترجمہ: زمانے کو برانہ کہو بے شک اللہ ہی زمانہ ہے۔

تواپاہج ہونے کے باوجود وہ اپنی کرسی سے اچھل کر نیچے آرہا۔ اس نے کہا میں گزشتہ 25سال سے اس پر غور کر رہا ہوں اور میں نے زمانے کو ایک حتمی تخلیقی عامل کی حیثیت دی ہے کہ زماں مکاں پر اس طرح عمل کرتا ہے جس طرح سینما کی تصویریں۔ جہاں زمانے میں آپ فلم چلاتے ہیں۔ ایک وقت کے دوران وہ متحرک تصاویر کو پیش کرتا ہے۔ اسی طرح زمانے میں جو مادی وجود ہیں' وہ ایک حرکت مسلسل میں وجود پا کر آگے جاتے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح زمانے میں دوراں (Duration) ہی حتمی صداقت ٹھہرتا ہے۔

اسی طرح کانٹ (Immanual KANT 1724- 1804) ہیگل (Friedrich Hegal 1770- 1831) نے اپنے اپنے تصورات دیئے۔ یہ بھی زمانے کو تصوراتی حد تک ہی وجود مانتے ہیں اور اس کو تصور سے باہر کی نوع کی حقیقت ماننے سے انکاری ہیں کہ ادراک زماں ہمارے حواس پر منحصر ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ تصور زمانہ ایک خیال کا انعکاس ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ نیٹشے (Friedrich Nietzsche 1844- 1900) نے زمانے کا انوکھا تصور دیا۔ اس کا خیال ہے کہ توانائی وقت میں اپنی صورتوں کو اختتام پذیر کرتی ہے۔ جب ایک مرتبہ زمانہ تمام موجودہ تصورات کو ختم کر لے گا تو پھر ایک وقت آئے گا کہ وہ ان کو دہرانا شروع کر دے گا۔ ایک زمانہ تھا جب میں نے نیٹشے کے اس تصور کا مطالعہ کیا تو اس نے مجھے بہت ہی Fascinate کیا کہ ایک وقت آئے گا جب زمانے میں موجودہ اشیاء ختم ہو جائیں گی' یہ صورتیں اور وجود ختم ہو جائیں گے تو زمانہ پھر انہیں دہرانا

شروع کردے گا۔ گویا ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جب دوبارہ اس حال میں آپ مجھے بولتا ہوا پائیں گے اور میں آپ کو سنتا ہوا۔ چونکہ قرآن اس تصور کی نفی کرتا ہے سو اس طرح کا واقعہ ظہور پذیر ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ قرآن کے تصور زماں میں رجعت نہیں اقدام ہے:

وحرم علی قریة اھلکنھا انھم لایرجعون . (۹۵:۲۱)

ترجمہ: وہ بستیاں جنہیں ہم نے ہلاک کردیا ہے ان پر دوبارہ لوٹ آنا حرام کردیا گیا ہے۔

اس لیے بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ اقبال نے سچ کہا تھا۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
اقبال اس کو بتلاتا کہ مقام کبریا کیا ہے؟

(بال جبریل)

آج تصورات بدل رہے ہیں۔ سٹیفن ہاکنگ زماں و مکاں پر گفتگو کسی اور انداز سے کرتا ہے۔ جب سے تخصصات (Compartmentalization) شروع ہوئی ہے سائنسز اپنے مختصر سے دوائر میں قید ہو گئی ہیں اور اب کوئی بھی زماں و مکاں کی آزادی نہیں مانتا۔ بلکہ آج یہ تصور کیا جاتا ہے کہ زماں و مکاں کو ایک دوسرے سے آزاد نہیں کیا جاسکتا۔ جب کائنات کی تفہیم ایک واضح اور باہم فریم ورک میں ممکن ہوگی تو متحرک زماں و مکاں کا تصور زیادہ آسان ہو جائے گا۔ کہ زماں و مکاں باہم مربوط ہیں اور زماں' مکاں و حرکت ایک ہی قسم کے اثرات رکھتے ہیں۔ ان کو جدا جدا کر کے نہیں سمجھا جاسکتا۔

یہ سب کچھ اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ زماں و مکاں پر موجود تمام مواد کا احاطہ مشکل کام ہے۔ اب زماں و مکاں کے باب میں میں اپنی ذاتی رائے رکھنا چاہوں گا۔ ذاتی اس لیے کہا کہ میں قرآن کی حتمی فہم کا دعویٰ نہیں کرتا۔ کچھ اور مفکرین آئیں گے جو دوسرے علوم میں بھی ماہر ہوں گے۔ وہ قرآن کو ایک بہتر Dimension of knowledge کے طور پر سمجھیں گے۔ اس طرح ہم جدید دنیا کو بہتر علمی سوغات دے سکیں گے۔ جس طرح اقبال نے پیام مشرق کی صورت میں مغرب کو سلام بھیجا۔ اندریں حالات ہم قرآن حکیم سے کوئی مستقل تصور زماں اخذ نہیں کرسکتے۔ زمانہ ایک انائے مطلق کے اشارے پر علیحدہ علیحدہ حرکت کرتا ہے۔ زمانہ ایک ایسی ابدیت ضرور ہے جسے ہم لامحدود نہیں کہہ سکتے:

وسخر الشمس والقمر کل یجری لاجل مسمی (۲:۱۳)'(۳۱:۹۹)
(۳۵:۱۳)'(۳۹:۵)

ترجمہ: "اور (اللہ نے) سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ یہ سب ایک مقررہ مدت تک چل رہے ہیں۔"

تمام کائنات ایک مقررہ وقت تک چل رہی ہے۔ تمام تخلیقات ایک وقت مقررہ تک موجود ہیں۔ تمام کائنات وقت کے ایک مخصوص فریم میں ہے۔ اس لیے اللہ نے بھی ہمارے سامنے یہ حقیقت رکھی کہ تمہیں سمجھ آئے یا نہ آئے' مگر کائنات کا وقت لامحدود نہیں' بلکہ محدود ہے۔ اس اس کی کارکردگی کس طرح ظہور پذیر ہوتی ہے' تو زمانے کی ہر حرکت کو خدا اپنے ساتھ متعین کرتا ہے۔ اپنے کلام کے ساتھ متعین کرتا ہے۔ اس کی مثال حضرت عزیر کے واقعہ میں بڑے واضح انداز سے نظر آتی ہے۔ اس مثال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زماں و مکاں کے پھیلاؤ کے بارے میں آج کی جدید سائنس اتنی Clear نہیں ہے' جتنا خدا کا کلام ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

والسمآء بنینها باید وانا لموسعون. (۵۱:۴۷)

ترجمہ: ہم نے آسمانوں کو اپنے دست قدرت سے بنایا اور ہم انہیں وسیع کر رہے ہیں۔

آج نظریہ اضافیت کے تحت سائنس میں یہ تصور رواج پارہا ہے کہ دنیا پھیل رہی ہے۔ اسی طرح موجودہ سائنس آگے بڑھے گی۔ قرآن کے تصورات کی مزید تصدیق ہوتی چلی جائے گی۔ کائنات بالا کے گیسی اجسام (Gaseous Volumes) کی حرکت کے دوران عظیم تر بادلوں کی حرکت سے جو اشارات ہمیں مل رہے ہیں۔ وہ کائنات کے پھیلاؤ کو ایک مثبت خیال دے رہے ہیں اس لیے کائنات کے پھیلاؤ پر کسی قسم کا شبہ نہیں رہا۔ مگر کائنات اور زمانے کا استعمال اور رفتار کا استعمال اللہ تعالیٰ نے جس حیثیت سے کیا ہے وہ ایک عجیب و غریب حقیقت ہے خداوند کریم اس طرف اشارہ حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعہ میں کرتے ہیں۔ جب حضرت عزیر علیہ السلام نے پروردگار سے پوچھا کہ تو مردوں کو زندہ کس طرح کرتا ہے:

او کالذی مر علی قریة وھی خاویة علی عروشھا قال انی یحی ھذہ اللہ بعد موتھا فاما تہ اللہ مائة عام ثم بعثہ قال کم لبثت قال لبثت یوما او بعض یوم قال

بل لبثت مأ ة عام فانظرالیٰ طعامك وشرابك لم يتسنه وانظرالی حمارك ولنجعلك اية للناس وانظرالی العظام كيف ننشزها ثم نكسوها لحما فلما تبين له قال اعلم ان الله علی كل شی ء قدير O (۲۵۹:۲)

ترجمہ: "یااس شخص کی طرح (عزیرؑ) جوایک ایسی بستی سے گزرا جو ویران ہو چکی تھی تو کہنے لگا اللہ اسے کس طرح دوبارہ زندہ کرے گا اس کی موت کے بعد۔ پس اللہ نے اسے ایک سو برس تک موت سے ہمکنار رکھا پھر اسے اٹھایا اور پوچھا تو کتنے عرصہ تک اس حالت میں رہا تو کہنے لگا ایک دن یا اس کا کچھ حصہ۔ فرمایا نہیں بلکہ ایک صدی تک۔ اب تو اپنے کھانے اور پینے کے سامان کو دیکھ کہ باسی تک نہیں ہوا۔ اور اپنے گدھے کو دیکھ تاکہ ہم تجھے لوگوں کے لیے نشانی بنائیں کہ کس طرح ہم نے اس کی ہڈیوں کو باہم جوڑا اور ان پر گوشت چڑھایا جب یہ حقیقت اس پر کھل گئی تو کہنے لگا میں جان گیا کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

یہ ایک عبرتناک واقعہ ہے۔ اس واقعہ پر انسان جتنا بھی غور کرے زماں و مکاں کی حیرت انگیز نوعیت سامنے آتی ہے۔ کہ خداوہ ہے جو زمانے کو روکتا ہے' زمانے کو Squeez کر دیتا ہے۔ وہ زمانے کو نارمل رفتار سے چلنے دیتا ہے جیسے ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس طرح زمانہ اللہ سے باہر' اس کے حکم سے باہر کوئی وجود نہیں رکھتا۔ زمانہ وہ احساس تفریق اشیاء ہے' جو پروردگار نے انسان کے دل و دماغ میں ڈال دیا ہے۔ زمانہ اللہ کی Internal Discovery Scheme ہے' جس کے تحت اس نے اشیاء و واقعات کو باہم Friction سے بچالیا ہے۔ اس نے مقام Friction کو معطل کرنے کے لیے زمانے کو وسعتیں بخش دیں' مگر یہ محدود ہے اس کی Destiny کی ایک حد ہے۔ زمانہ مسلسل (رورواں) ہے۔ زمانہ انسانی ذہن کی وہ سہولت ہے' جس کے تحت اشیاء و حوادث نارمل روٹین سے گزرتے ہوئے Friction سے بچتے ہیں اور ان میں Jumble پیدا نہیں ہوتا۔ امام شافعیؒ نے فرمایا:

الوقت سيف

یعنی زمانہ کاٹتی ہوئی تلوار ہے جو اشیاء کو الگ الگ کر دیتی ہے۔ اگر زمانہ نہ ہو تو اشیاء کی تفریق ختم ہو جائے۔ زمانہ کو پروردگار نے کلیتاً اپنی مرضی کا پابند رکھا ہے۔ جہاں چاہتا ہے اسے گزارتا ہے اور جہاں چاہتا ہے اسے نہیں گزارتا۔ اصحاب کہف پر نہیں گزارتا ہم پر گزار دیتا ہے۔ گدھے پر گزار دیتا ہے' کھانے پر نہیں گزارتا۔ ایک دن کی وسعت سے سو سال کو چوبیس گھنٹے میں محدود کر کے اسے عزیر پر گزار دیتا ہے اور شب معراج میں پوری کائنات کا

وقت ساکت کر کے واپسی پر کنڈی کو اسی طرح ہلتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔ شب معراج میں اس پورے زمانے کی کسی چیز کو اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرنے دیتا۔ ایک مکمل سکوت زمانہ ہے اور اس سکوت زمانہ میں حرکت اس وقت ملتی ہے' جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ام ہانی کے گھر دوبارہ داخل ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مجھے پتا نہیں کہ کتنا وقت گزرا ہے' مگر جب میں اندر داخل ہوا تو دروازے کی کنڈی ابھی ہل رہی تھی۔

مگر فہم انسانی نے ابھی اپنی ارتقا کا بہت کم سفر طے کیا ہے۔ کائنات کی ان بعید سمتوں کی طرف انسان کے قدم نہیں پہنچے۔ ابھی سات زمینوں کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ کائنات کی ان سات زمینوں کا دور پہنچانے میں انسان نے وہ Signal وصول کرنا شروع کر دیئے ہیں' جن پر گمان ہے کہ یہ کسی اور حیات اور سر زمین سے آنے والے Signals ہیں۔ انسان نے پندرہ کھرب نوری سال کے فاصلوں پر ایک چمکتے ہوئے شہر کو دیکھنے کی کوشش ضروری کی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

ولقد خلقنا فوقکم سبع طرائق وما کنا عن الخلق غفلین. (۲۳:۱۷)

ترجمہ: "اور بے شک ہم نے تمہارے اوپر سات راستے پیدا کیے۔ اور ہم (اپنی) تخلیق سے غافل نہیں ہیں۔"

مگر انسان ان آسمانوں کی عظیم ترین وسعتوں میں سے ابھی پہلے آسمان کی وسعت سے بھی نہیں گزرا۔

جو سوال ہمارے سامنے آغاز کلام میں تھا ہم پھر اسی سوال کی طرف پلٹتے ہیں۔ قرآن حکیم کی ایک آیت سے استنباط کیا جاتا ہے کہ انسان کبھی نہ کبھی اس کائنات کی تسخیر کو ضرور پالے گا' مجھے بھی آپ کے سامنے اس آیت کو پیش کرنا ہے اور اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ کیا ہم اس قرآنی آیت کو سمجھنے کے بعد یہ گمان کریں کہ انسان کائنات کی کلی تسخیر کے قابل ہو جائے گا۔

یمعشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السموات والارض فانفذوا لاتنفذون الابسلطن. (۳۳:۵۵)

ترجمہ: "اے اجتماع جن وانس! اگر تم سے ہو سکے تو آسمانوں اور زمینوں کی حدوں سے نکل جاؤ۔ تم ان حدوں سے نہیں نکل سکتے' مگر سلطان کے ساتھ۔"

یعنی اگر تم زمینوں آسمانوں کی سرحدوں سے نکل بھاگ سکتے ہو تو نکل بھاگو مگر تم ایسا

نہیں کر سکتے۔اس کے لیے بڑی قوت کی ضرورت ہے۔ بغیر دلیل 'بغیر قوت کے تم ان اقطار السموات والارض سے نہیں نکل سکتے۔ یہاں توضیح کے دو گروہ ہوں گے۔ایک گروہ نے یہ کہا کہ اس آیت سے تسخیر کائنات کا اشارہ ملتا ہے 'ایک گروہ کہتا ہے کہ اس آیت سے مراد ہے کہ اگر تمہیں سلطان حاصل ہو جائے تو تم اقطار السموات سے گزر سکتے ہو۔ دوسرے نے کہا نہیں ایسا نہیں ہے 'بلکہ اللہ یہ کہہ رہا ہے کہ تم جتنی بھی قوت کو پالو میرے زمین و آسمان اتنے وسیع ہیں کہ تم کبھی بھی اقطار السموات والارض سے نہیں گزر سکتے۔ مگر تاریخ انسان و مذہب ہمیں بتاتی ہے کہ شاید دونوں معنی اس آیت کے مطلب کو پورا نہیں کرتے۔ اس لیے کہ ایک انسان زمین و آسمان سے گزرا ہے۔ ایک انسان اقطار السموات الوارض سے گزرا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سلطان کی تعریف قرآن خود بیان کرتا ہے:

وقل رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنك سلطانا نصیرا. (۸۰:۱۷)

ترجمہ: "اور فرمادیجئے! اے میرے رب مجھے داخل کر صدق کے ساتھ اور نکال صدق کے ساتھ اور مجھے اپنی جانب سے سلطان نصیر (مددگار دلیل و نصرت) عطا فرما۔"

سلطان نصیر کا تعلق اللہ سے ہے۔ سلطان غلبہ اور دلیل بھی ہے۔ غلبہ کی دلیل کا تعلق اللہ کی شناخت اور پہچان سے ہے۔ یہ اللہ کے جاننے سے متعلق ہے۔ یعنی آیۃ الا سلطان میں فرمایا کہ اگر تم خدا کو چاہو گے 'اگر پروردگار کی اطاعت کرو گے 'اگر مجھے ساتھ رکھو گے کہ میں ہی اصل سلطان نصیر ہوں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پلک جھپکنے میں رات کی رات ان قیود سے نکل سکو گے:

سبحان الذی اسریٰ بعبده لیلا من المسجدالحرام الی المسجدالاقصیٰ الذی بر کنا حوله لنر یه من ایتنا انه هو السمیع البصیر O (۱:۱۷)

ترجمہ: "پاک ہے وہ ذات جو لے گیا راتوں رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرد اس نے برکت رکھی تا کہ اسے اپنی نشانیاں دکھائے۔ بے شک وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"

آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں اللہ نے اپنی قدرت اور اپنی برکت کو اس طرح ظاہر کیا کہ ایک انسان کو زماں و مکاں کے تعطل سے گزار دیا۔ ان مضبوط ترین اقطار السمولت سے گزار کر اپنا ظہور بخشا۔ یہاں بھی اس کی مراد یہ ہے کہ اے بندگان خدا! اگر تم اپنی جد و جہد جاری رکھتے

ہو، مگر کسی تحقیق و جستجو کے لیے آپ کے پاس تسلسل نہیں' آپ اتنی بڑی کائنات میں اگر ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ میں بھی بدل جاؤ' تو بھی اس کائنات کی وسعتوں کو جو کھرب ہا کھرب نوری سالوں تک پھیلی ہیں' نہیں پا سکتے۔ کیونکہ تسخیر کائنات کا یہ طریق مشکل ہے۔ مگر ایک آسان ترین راہ بھی ہے۔ اللہ نے آپ کو عقل و حکمت اس لیے دی کہ زمین و آسمان کی ان تخلیقات پر غور کرتے ہوئے آپ اسم اعظم کو حاصل کر لیں۔ آپ اللہ کی دوستی کو حاصل کر لیں۔ جب کو خدا کے وجود اور موجودگی کا اور اس بات کا کہ جب آپ لاالہ سے غور کرتے ہوئے الااللہ تک پہنچ جائیں وہ آپ کا ہمسفر ہو جائے' آپ کا ہمسایہ ہو جائے تو پھر آپ کے لیے یہ ممکن ہو گا کہ آپ اقطار اسموات سے نکل سکو۔

جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں ایک جن نے کہا میں بہت جلدی تین ہزار میل فی ثانیہ کے حساب سے آپ کے محفل سے اٹھنے تک' ظہر کے وقت تک آپ کے سامنے تخت سبا لاکر رکھ سکتا ہوں۔ مگر ایک ایسا شخص جسے کتاب کا علم دیا گیا تھا یعنی آصف بن برخیا! اس نے کہا کہ اے نبی اللہ! اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں پلک جھپکنے میں اسے آپ کے پاس پہنچا دوں:

قال الذی عندہ علم من الکتب انا اتیک بہ قبل ان یرتدالیک طرفک. (۲۷:۴۰)

ترجمہ: ''کتاب کا علم رکھنے والے نے کہا کہ میں تخت اس سے بھی پہلے آپ کے سامنے لا رکھوں گا کہ آپ اپنی پلک جھپکیں۔''

خدا کی معیت میں' خدا کی نصرت کے ساتھ' اس کی تائید کے ساتھ آپ یقیناً ان لطیف ترین کائناتی دریچوں (Sophisticated Cods of Universal Openings) تک پہنچ سکتے ہیں۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان زمینوں آسمانوں کی وسعتوں سے بڑے اطمینان و آرام سے' بڑی حفاظت سے گزار سکتے ہیں۔ جب جبرائیل امین علیہ السلام آسمان اول کے دروازے پر پہنچے تو محافظ فرشتے نے کہا کہ کون؟ تو فرمایا جبرائیل۔ جواب آیا اکیلے ہو یا کوئی ساتھ ہے۔ فرمایا محمد ﷺ ہیں۔ پوچھا گیا خود آئے ہیں یا بلائے گئے ہیں؟ اس ساری Query کے بعد فرمایا گیا اھلاً و سھلاً مرحبا! حدیث بخاری ہمیں بتاتی ہے کہ تقریباً ہر دروازہ آسمان پر اس طرح سوال و جواب ہوئے۔ یہاں اقطار السموات سے گزرتے ہوئے رسول ﷺ کی ہر دروازے پر ایک گارڈ باضابطہ چیکنگ کرتا ہے۔ یہی سلطان ہے' کہ اللہ تعالیٰ نے کہا اس سفر و تسخیر کے لیے امکان تب ہے جب تم اللہ کو ساتھ لے لو۔ یہ غلط

ہے کہ اس کے لیے صرف سائنسی تحقیقات مدد ہوں گی کیونکہ نہ زمین کے پاس اتنا وقت ہے' نہ آسمانوں کے پاس کہ اپنے آپ کو قائم و باقی رکھیں۔ نہ تقدیر الٰہی میں اتنی گنجائش ہے کہ آپ اتنا عرصہ زندہ رہیں۔ اور اتنی دور جا سکیں اور جن تباہ کاریوں کے اسباب آج کے انسان نے جمع کر لیے ہیں وہ ضرور اس دنیا کو ایک بار پھر تہذیب انسانی کے اس کھنڈراتی ماحول میں پہنچا دیں گے جہاں سے' غار سے یہ چلی تھی۔ حدیث رسول ﷺ ہے کہ: "اگر ایک قدیمی انسان نے ایک گوہ کے سوراخ میں ہاتھ دیا تو تم بھی ضرور اس گوہ کے سوراخ میں ہاتھ دو گے۔" اور تہذیب انسانی یہ ایک اجتماعی کلیت کا توارد مرتب ہوتا ہے۔ کہ جیسے انسان جوان ہوا' عقلمند ہوا' بوڑھا ہوا اور خاک ہوا۔ اسی طرح پوری نسل انسانیت بھی ابتدائے حال میں Cave Man سے چلتے ہوئے' Neolithic Age سے چلتے ہوئے' New Stone Age سے چلتے ہوئے آج کی جدید تہذیبات میں اپنے شعور اور اپنے شباب تک پہنچی اب وہ بڑھاپے کی طرف مائل ہے۔ خداوند کریم ہمیں توفیق دے کہ ہم باقی ماندہ عرصہ میں علم کو خدا کے لیے حاصل کریں اور اس جدوجہد کی کوشش کریں کہ اگر دنیا نے باقی رہنا ہے تو خدا کے توسط سے سیکھتے ہوئے ہم دنیا سے آگے بڑھ جائیں گے۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ محنت و مشقت میں سستی نہ کرنا' میری یاد میں تغافل نہ برتنا' کائناتی حقائق اور میری تفہیم میں تغافل نہ کرنا۔ اگرچہ اس راہ میں دکھ اور کوفتیں بھی ہوں گے' کیونکہ آزمانا ہماری عادت شریفہ ہے:

ولنبلونكم بشيء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصبرين. (۱۵۵:۲)

ترجمہ: "اور ہم تمہیں آزمائیں گے کچھ خوف اور کچھ بھوک اور مال و جان اور پھلوں کے نقصان سے اور بشارت ہے ان کے لیے جو (اس سب پر) صبر کرنے والے ہیں۔"

ہم آزمائیں گے ضرور' خوف سے' نقص سے' نقصان سے' بلا سے' جور سے اور جبر سے۔ انسان کو تو چاہیے کہ اللہ سے کہے کہ یہ جو جور و جبر کی آزمائش ہے یہ ہمارے پائے استقامت میں لغزش نہیں لا سکتی۔ ہمیں چاہیے کہ اللہ سے کہیں کہ ہمیں اور آزمایئے ابھی ہمارا حال بہتر ہے ابھی ہم آپ کے حضور اور Service کر سکتے ہیں۔

تو جب عہد بلا گزرے گا تو مژدہ فلاح بھی آئے گا۔ اے بندے تو عرصہ آزمائش میں غم نہ کر' اگر کوفت اور تکلیف آ جائے تو اناللہ وانا الیہ راجعون تیرا وطیرہ ہونا چاہیے۔ تو ہماری

طرف رجوع کر یہ نہ کہنا کہ میرا رزق کسی جادوگر نے بند کر دیا ہے۔ یہ نہ کہنا کہ مجھ پر آسیب ہو گیا ہے۔ تو رجوع ہماری طرف کر جادوگروں کی طرف نہ کر۔ یہ نہ کہنا کہ بندشیں انسان کرتے ہیں' بلکہ جب یہ بندشیں ہو جائیں' جب کچھ تنگی اور عسرت ہو جائے تو ان مع العسر یسرأ یاد رکھنا کہ ہر تنگی کے بعد کشادگی ہے بلاشبہ ہر تنگی کے بعد کشادگی ہے۔ اے انسان اگر تیرا رویہ یہ رہا تو:

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین. (۱۳۹:۳)

ترجمہ: "اور تم سستی نہ کرنا اور غم زدہ نہ ہونا اور تم ہی غالب آؤ گے اگر تم صاحب ایمان ہو۔"

تو مجھے اپنے جلال و اقتدار کی قسم ہے کہ میں تجھے زمین و آسمان میں غالب کروں گا اور اگر تم ان دو پہلوؤں (ولا تھنوا ولا تحزنوا) سے دامن بچا کر نکل گئے تو میرا وعدہ ہے کہ تمہیں زمین و آسمان میں غالب کر دوں گا۔ یہی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے!

وماعلینا الاالبلاغ O

خطبہ چہارم

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق و اجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا (۱۷:۸۰)

صحرائے گوبی میں ترکمانوں کے قافلے جب دن بھر کی تگ و تاز کے بعد رات کو اپنے خیموں کے کنارے اترتے تھے اور آگ کے الاؤ کے گرد مسحور کن داستانوں میں مگن ہو کر اپنی تھکان کو دور کرنے کا سامان کرتے تھے تو وہ نہیں جانتے تھے کہ حضرت انسان کی زندگی' اس کے واقعات اور ان کی ترتیب' زماں و مکاں میں حضرت انسان کا ظہور اور پھر اس کا فنا ہو جانا...... یہ سب کچھ ان کی سب داستانوں سے بڑی داستان ہے۔ اس داستان کا آغاز کب ہوا؟ ارشاد ربانی ہے:

هل اتی علی الانسان حین من الدهر لم یکن شیاء مذکورا (۷۶:۱)

ترجمہ:- بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز ہی نہ تھا (اس کا نام و نشان بھی نہ تھا' پھر بتدریج کئی مراحل سے گزرتے ہوئے انسان بنا)۔

یعنی اربہا ارب سال تک انسان پر ایسا زمانہ بھی گزرا جب وہ کوئی قابل تذکرہ شے نہ تھا۔ پھر وہ مرحلہ آیا جب انسان کو ناقابل تذکرہ شے سے قابل تذکرہ شے کے مرحلے میں داخل کیا گیا۔

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتلیه فجعلنه سمیعا بصیرا (۷۶:۲)

ترجمہ:- بے شک انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا جسے ہم پلٹتے رہتے ہیں۔ پھر ہم نے اس کو سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔

یہ سارے مراحل کس مقصد کے لیے تھے؟ ان کا تذکرہ الدھر:۳ میں یوں کیا گیا:

انا هدینه السبیل اماشا کرا واما کفورا (۷۶:۳)

ترجمہ:۔ہم ہی نے اسے راہ حق دکھادی' خواہ وہ شکر گزار ہو یا ناشکر گزار رہے۔
یعنی دراصل یہ ایک امتحان تھا کہ انسان اپنی ترجیح اولیٰ کے طور پر رب ذوالجلال کو چنتا ہے یا اس کا انکار کرتا ہے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تمام حیاتیاتی مخلوقات کو ایک ہی جینیاتی مرکز سے تخلیق کیا گیا اور پھر برسوں تک انسان حیوانات سے کسی طور مختلف نہ تھا۔ اس کی اپنی کوئی بھی الگ شناخت نہ تھی۔ مدتوں تک ماہرین عمرانیات اس امر میں متردد تھے کہ انسان کا سراغ کیسے تلاش کریں اور اس حقیقت کو کس طرح دریافت کریں کہ انسان دوسری مخلوق سے کب الگ ہوا اور اس کی شناخت کا آغاز کب سے ہوا۔ اس مسلسل تحقیق کے نتیجے میں اس نوعیت کا پہلا سراغ نو کروڑ سال قبل کا ملتا ہے اور پہلے انسان نما مخلوق کا سراغ پانچ' چھ کروڑ سال پہلے کے زمانے میں نظر آتا ہے۔ جب مخلوقات کے تصادم باہمی میں دو گروہ ہو گئے۔

1- وہ مخلوقات جنہوں نے زمین کی طرف رخ کیا اور زمین کے بطن یعنی سوراخ وغیرہ کو اپنا مسکن بنایا مثلاً سانپ وغیرہ۔

2- وہ مخلوقات جنہوں نے زمین کے مخالف سمت یعنی درختوں کی بلندیوں کی طرف رخ کیا۔ یہ پرائمری حیوان کہلائے۔ اس نوع کی مخلوق انسان تو نہ تھی کیونکہ اس کے ہاتھ پاؤں جڑے ہوئے تھے' قد چھوٹا تھا' آنکھیں برائے نام تھیں اور اس کا دماغ 475CC تھا جبکہ آج ایک نارمل بچے کا دماغ 1750CC ہوتا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس مخلوق کا ارتقاء شروع ہوا۔ اس نے اپنی جبلتوں کو Define کرنا شروع کر دیا۔ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں کے انگوٹھوں اور انگلیوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ آنکھوں کے ڈیلے حرکت کرنے لگے۔ اگر آج کا یہ ترقی یافتہ انسان اس دور کے انسان کو دیکھ لے تو اس تصور سے ہی شرما جائے کہ کبھی اس نوع کی کوئی مخلوق بھی اس کے آباؤ اجداد میں شامل تھی۔ اس دور کا یہ انسان درختوں سے آگے بڑھنے کے لیے تگ ودو کر رہا تھا مگر یہ انسانی دور میں تب داخل ہوا جب اس نے اپنے جینیاتی رویئے (Genetic Behaviour) اور اپنی جبلیت (Instinct) کے خلاف جدوجہد شروع کر دی۔ وہ جینیاتی رویہ (Genetic Behaviour) جو اس میں نسل در نسل چلا آ رہا تھا' وہ اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرنے لگا اور اس نے اس پورے Pattern سے جدا ہونے کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔

انسان کی یہ ابتدائی (Primitive) شکل معاشرے کے قابل نہ تھی مگر انسان کے اعلیٰ تر درجے تک پہنچنے کے لیے بنیاد اس کی یہی شکل تھی اور اس سے ہی آگے بڑھتے ہوئے ہم آج کی State of Human Being تک پہنچے ہیں۔ سائنس نے دور اول کے اس انسان کو دور جدید کے انسان کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے Homonides کہا ہے۔ Homo انسان کو کہتے ہیں اور Homonides کا مطلب ہے انسان سے مشابہہ مخلوق مگر یہ گوریلا اور چمپینزی سے بھی زیادہ بدشکل تھے۔ تاہم یہ زندگی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ ایک آدھ دن میں نہیں ہوا بلکہ چھ کروڑ سال کے سفر کے بعد ہمیں ایک ایسی مخلوق کا سراغ ملتا ہے جو بہت ہی کمتر درجے میں انسان سے مشابہت رکھتی ہے۔ اس سے آگے بڑھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کو تقسیم کرنے' انہیں تباہ کرنے' زندگی کو از سر نو شروع کرنے اور انسانی حیات میں متنوع تبدیلیاں پیدا کرنے کا باعث دو عوامل رہے ہیں:-

1-ماحولیاتی تبدیلی اور موسم کا تغیر و تبدل

2-برفانی طوفان (Glaciers) سے ہونے والی آئس رین (Ice Rain)

یہ Ice Rain چھوٹی موٹی برفباری نہیں تھی بلکہ یہ ایک ایک میل تہہ ہوتی تھی اور یہ اب تک ۲۰۰ بار ریکارڈ ہوئی ہیں۔ اسے اللہ تعالیٰ نے قطع و برید کے عمل (Process of Elimination) کے طور پر استعمال کیا کہ وہ تمام غیر مطلوبہ مخلوق ختم کر دی جائے جو اپنے اندر ارتقاء کی گنجائش نہیں رکھتی تھی یا جو بدلتے حالات میں بہتر طور پر اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتی تھی اور ایک تازہ (Genetic Trend) سے ابھرتی ہوئی مخلوق کو فروغ دیا جائے۔ یہ ایک طرح کا Process of Selection تھا جو مدتوں میں جا کر مکمل ہوا۔ ارشاد ربانی ہے:-

وجعل فیها رواسی من فوقها و بٰرك فیها و قدر فیها اقواتها فی اربعة ایام ط سواء للسائلین (۴۱:۱۰)

ترجمہ:- اور اس نے اس زمین میں اوپر سے بھاری پہاڑ رکھے اور اس میں بڑی برکت رکھی اور اس میں مخلوق کے لیے سامان معیشت مقرر کیا۔ چار دن کے اندر جو تمام طلبگاروں کے لیے یکساں ہے۔

گویا انسان کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہر اس چیز کو پیدا کیا جس کی انسان کو

ضرورت تھی۔ یہ ایک عمل انتخاب تھا جس کے تحت انسان کو مختلف مراحل سے گزارتے ہوئے پیدا کیا گیا۔ حال ہی میں تنزانیہ میں ایک ڈھانچہ ملا جو Ice age کے پگھلنے سے سامنے آیا۔ اس ڈھانچہ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ یہ انسان گھر بنانے کے لیے پتھر استعمال کرتا تھا یعنی اس نے اپنی نسل کی حفاظت کے لیے بندوبست کرنا اور عمومی زندگی میں Tools استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہاں سے انسان اور جانوروں میں واضح فرق شروع ہوا کیونکہ جانور Tools نہیں بناتے اور نہ ہی وہ اپنی زندگی پلان کرتے ہیں۔ پلان کرنا ان کا کلچر نہیں ہوتا۔ یہ انسان Austro Flixin مخلوق تھی جو واضح طور پر سوچنے کی کوشش کر رہی تھی مگر سوچ کی یہ ابتدائی کوشش محدود تھی جو بتدریج اضافہ پذیر تھی۔ اس کا دماغ بھی بڑھ رہا تھا جو اب 700CC ہو چکا تھا۔ یہ سپیشیز (Species) چلی کہاں سے؟ اس کا واضح جواب ماہرین حیاتیات (Biologists) اور ماہرین بشریات (Anthtropologits) نہیں دے سکے مگر اس سارے عمل میں یہ الوہی طریق کار فرما رہا کہ وہ یک بیک (Sudden) کوئی کام نہیں کرتا بلکہ اس نے انسان کو عقل کا Tool آہستہ آہستہ دیا:۔

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتليه فجعلنه سميعا بصيرا (۲:۷۶)

ترجمہ:۔ بلا شبہ ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائش میں ڈالیں اور اسے ہم نے سننے والا' دیکھنے والا بنایا۔

اسی انسان نے آگے بڑھ کر عظیم ذمہ داریوں کا حامل بننا تھا۔ اس کے بتدریج ارتقاء کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج ایک گوریلا کا دماغ 850CC ہے جبکہ Austro Flixin انسان کا دماغ 700CC تھا۔ اس کے بعد دس' بیس لاکھ سال قبل کے درمیان افریقہ اور یورپ میں ایک اور انسان کا سراغ ملا جسے Homo Habilis یا Homo Erectus کہا گیا ہے۔ یہ نسبتاً چالاک تھا۔ اس کا نشان کلہاڑا ہے۔ یہ اس کے Edges تیز کرنے کے فن سے آگاہ تھا۔ یہ شکاری تھا اور اپنے پلان بنا سکتا تھا۔ اگر آج ہم انسان کو دیکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آج لوگوں کو غم روزگار ہی اتنا زیادہ ہے کہ خدا کے خیال کے لیے کسی کے پاس فرصت ہی نہیں ہے۔ یہی المیہ اس دور کے انسان کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا جس کا ادراک خداوند تعالیٰ کو بھی تھا' لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے جانور پیدا کیے جو ہاتھی سے بھی بڑے تھے۔ ان جانوروں کا شکار کرنے کے بعد انسان کے پاس بڑا وقت بچتا تھا کہ وہ کچھ وقت ذات باری تعالیٰ کے لیے غور و فکر کرنے میں بھی صرف کر سکے۔ اس طرح کا ایک واقعہ ہمیں دور نبوت میں

بھی ملتا ہے کہ جب صحابہ کرامؓ ایک مرتبہ جہاد پر گئے ہوئے تھے تو ان کی خوراک ختم ہو گئی۔ بھوک کی شدت نے جب انہیں آگھیرا تو انہوں نے دعا کی۔ ایک جانور پانی سے باہر آیا جو اتنا بڑا تھا کہ اس کے جبڑے کے نیچے سے اونٹ نکل جاتا تھا۔ صحابہ رسولؐ اسے مہینہ بھر کھاتے رہے۔ اسی طرح زمانہ قدیم میں بڑے بڑے جانوروں کو پیدا کرنے میں حکمت تھی کہ وہ کچھ دیر کے لیے فکر معاش سے آزاد ہو کر غور و فکر اور تفکر کر سکیں۔

اس انسان نے جسے Homo Erectus کہتے ہیں' آہستہ آہستہ سیدھا چلنا شروع کر دیا۔ اس کا نشان کلہاڑا تھا۔ اب اس کا دماغ 950CC سے 1050CC ہو چکا تھا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ آج انسانی بچے کا دماغ 1750CC ہوتا ہے۔ اگرچہ اس مرحلے پر اس کا دماغ بڑھ چکا تھا مگر یہ انسان نہیں تھا۔ ابھی صرف انسان کے آباؤ اجداد آرہے تھے اور کاروان حیات بتدریج آگے بڑھ رہا تھا۔

اس کے بعد جرمنی میں انسان کا ایک سراغ ملا۔ یہ ۲' ۱سے لے کر ۸' ۱۰ لاکھ سال پہلے کا انسان ہے۔ اسے Homo Sapian Neamderthen کا نام دیا گیا۔ یہ بھی آج کے انسان کے آباؤ اجداد میں شامل تھا۔ اس میں بہت سی صفات تھیں جو اس سے پہلے کے انسان میں موجود نہیں تھیں یعنی ہر لحاظ سے ارتقاء جاری تھا۔ غور و فکر اور تفکر کی جس نہج پر قدرت انسان کو چلانا چاہتی تھی' اس کے اثرات اس کی خارج کی زندگی میں نظر آنے لگے تھے۔ یہ انسان اپنے مردوں کو دفن کرتے تھے۔ اسی دور سے تعلق رکھنے والے ایک بچے کی قبر تاشقند میں اور ایک بڑے فرد کی قبر عراق میں ملی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس دور کے انسان کے اندر فن کی حس و شعور بھی موجود تھا۔ وہ آرٹ جانتا تھا اور اپنے اعزاء کی قبروں پر پھول بھی چڑھاتا تھا مگر کیا اس دور کے انسان کے پاس خدا کا تصور بھی موجود تھا؟ ہرگز نہیں کیونکہ ابھی اس کی ذہنی استعداد اتنی بلند نہیں ہوئی تھی کہ وہ خدا کا تصور کر سکتا اور معرفت خداوندی کے بوجھ کو اٹھا سکتا۔ تاہم اس میں اور اس سے پہلے دور کے انسان میں اتنا فرق ضرور تھا کہ اس میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کہیں زیادہ بڑھ چکی تھی۔ اس میں Moralities کو Define کیا جانے لگا تھا۔ عورت اور مرد الگ الگ ہو چکے تھے اور اچھے برے کی تمیز کے پیمانے وضع کیے جانے لگے تھے۔ اس لیے اس دور کے انسان کو Homo Sapian کا نام دیا گیا۔ Homo انسان اور Sapian سوچنے والے کو کہتے ہیں یعنی سوچنے والا انسان۔ چونکہ باقی جانوروں کی نسبت انسان کا بچہ دیر سے بڑا ہوتا ہے' اس لیے اس دور

کے انسان نے اپنے بچوں کے تحفظ کے لیے بھی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ اس نے کالونیاں بنانا شروع کر دی تھیں۔

اگرچہ انسان کے شعور میں ارتقاء بتدریج جاری تھا مگر اس کی عقل، شعور اور تفکر کی صلاحیت کے ارتقاء میں بڑی پیش رفت تب ہوئی جب کسی Specis نے اپنے Genetic Code کی صدیوں کی روایات کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت بھی Homo Sapian Neamderthen ہی کے دور میں وقوع پذیر ہوئی۔

اس کے بعد Old Stone Age کا دور آیا۔ اس کے بعد Homo Sapian آیا۔ ایک ترقی یافتہ اور بلوغت شدہ انسان کا سراغ آج سے 10 ہزار سے 25 ہزار سال پہلے کے عرصے میں ہے۔ یہ ایک بہتر اور برتر انسان تھا جس نے طویل صدیوں کا سفر طے کر کے یہ منزل حاصل کی تھی۔ اس نے اپنے کلچر کی تشکیل شروع کر دی تھی اور اپنے لیے، اپنے معاشرے کے لیے قوانین بنانے کا آغاز کر دیا تھا۔ آدمؑ کا وجود اسی عرصے میں ہے۔ جب انسان نے شعور کی اعلیٰ منزل کو حاصل کر لیا تھا اور وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ وہ توحید اور معرفت ربانی کی عظیم امانت کا بار اٹھا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو قبول کر سکتا اور اس کے عطا کردہ حسن و قبح، اچھے و برے کے معیار پر مبنی زندگی کو اختیار کر سکتا۔ جب رب ذوالجلال نے انسان کو اپنا خلیفہ فی الارض بنانے کا فیصلہ کیا اور فرشتوں کو جب اس مشیت ایزدی کا علم ہوا تو ان کے سامنے Homo Sapian Neamderthen تھا۔ جو فکر و شعور میں پست اور فطرت و طبیعت کے لحاظ سے بھی اتنا زیادہ بالیدہ اور مہذب نہ تھا۔ اسی لیے جب رب ذوالجلال نے فرمایا:

واذ قال ربك للملئكة انى جاعل فى الارض خليفة (۲:۳۰)

ترجمہ:-اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر ایک نائب بنانے والا ہوں۔

تو اس کے جواب میں فرشتوں نے عرض کی:

قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء (۲:۳۰)

ترجمہ:-فرشتوں نے عرض کیا (اے پروردگار) کیا تو زمین میں ایسے کو نائب بنائے گا جو شر و فساد پھیلائے گا اور خونریزی کرے گا۔

اسی طرح کا مضمون ہمیں ایک حدیث میں ملتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو معتبر

اور معزز قرار دے کر اسے اپنا خلیفہ فی الارض بنانے کا اعلان فرمایا تو ملائکہ نے کہا "اے پروردگار تو اسے اپنا خلیفہ بنائے گا جو کھاتا پیتا ہے' مباشرت کرتا ہے' دنیاداری کے حقیر امور میں مصروف رہتا ہے تو دنیا انہیں دے دے اور آخرت کی عزت و شرف ہمیں عطا کر دے۔" تو اس پر رب ذوالجلال نے ارشاد فرمایا "اے ملائکہ۔ میں نے تمہیں حرف "کن" سے پیدا کیا ہے مگر انسان کو "کن" سے نہیں بلکہ اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ تم برابر نہیں ہو سکے۔"

Homo Sapian ہی کا زمانہ ہے۔ جب انسان نے شعور کی پہلی جھلک کو پایا۔ یہ آج سے 10 ہزار سے 40 ہزار سال قبل تک کا زمانہ ہے۔ جب انسان نے اپنے شعور کو پوری طرح Exploit کرنا شروع کر دیا۔ اس پورے ارتقائی عمل سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جب تک ایک مسلسل تجرباتی دور مکمل نہ ہو' کوئی اصول وضع نہیں ہوتا اور جب تک انسان نے اپنے شعور کو مکمل طور پر استعمال کرنا اور Exploit کرنا شروع نہیں کر دیا' اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی ہدایت کو محفوظ اور غیر منزل ہی رکھا۔ تا آنکہ وہ دور آیا' جب حضرت آدمؑ کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا گیا۔ عین ممکن ہے کہ صحیفہ آدمؑ ایک ہی آیت یا ایک ہی ہدایت پر مشتمل ہو۔ چونکہ آدم کو ان تمام داخلی اور خارجی حالات میں بے شمار حالات کو از سر نو سیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ ایک نئے ماحول میں ایک نوع کے تربیتی اور ارتقائی دور میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس لیے انہیں ایک حکم اور ایک آیت کا سہارا دیا گیا کہ تم نے اس پر عمل کرنا ہے۔ زندگی کے ایک محدود سے حصے میں انہیں حکم الٰہی کا پابند کیا گیا جبکہ بقیہ زندگی میں انہیں آزاد چھوڑ دیا گیا کیونکہ ابھی اس انسان کا دماغ اور ذہن اتنا بالیدہ نہ ہوا تھا کہ وہ زیادہ احکامات کا بوجھ اٹھاتا۔

اس لیے آدمؑ کی عمر بھی ایک ہزار سال ہے کیونکہ اس دور کے انسان کا ذہن اتنا زیادہ فنکشنل نہیں تھا۔ اندریں حالات یہ ایک قدرتی بات تھی کہ عمر زیادہ عطا کی جاتی تاکہ تفکر اور غور کے لیے زیادہ وقت مل سکتا۔

تاریخ انسانیت میں یہ ایک الوہی اصول رہا ہے کہ کسی بھی نسل انسانی میں پیغمبر وہی ہوتا ہے جو نہ صرف ہدایت یافتہ ہوتا ہے بلکہ اپنے معاشرے کا اعلیٰ ترین ذہن بھی ہوتا ہے کیونکہ اگر معاشرے میں نبی سے سوا کوئی دوسرا زیادہ ذہین فرد بھی موجود ہو تو یہ انصاف سے بعید ہوگا۔ گویا امانت علم اسے ہی ملے گی جو زیادہ سے زیادہ ذہین ہوگا۔ چونکہ آدمؑ اس دور کی نسل انسانی میں ذہین ترین فرد تھے' سو آپ کو پیغمبری اور رہبری کے لیے چنا گیا۔ اس طرح

ہدایت اور شرف انسانیت کو عطا کیا گیا۔

انسان کو موجودہ ارتقائی دور تک پہنچنے میں کروڑوں سال لگ گئے کیونکہ وہ جبلت جو جانوروں سے مشابہ تھی' اس سے ایک آدھ صدی میں انسان الگ نہ ہو سکتا تھا۔ اسی جبلت کو "نفس" کہتے ہیں جو ان خصوصیات پر مشتمل ہے جو انسان نے جینیاتی طور پر ورثہ میں حاصل کی ہیں۔ مثلاً قتل و غارت گری' Agression' نفرت اور اس طرح کے دیگر عیب۔ انہی کے خلاف انسان کی جدوجہد اسے خدا تک لے جاتی ہے۔

واما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوىٰ (۷۹:۴۰)

ترجمہ:- اور جو کوئی (قیامت کے دن) اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور اپنے نفس کو (ہر بری) خواہش سے روکا ہوگا (اللہ کے حقوق ادا کرنے میں نفس پر قابو پایا ہوگا۔ اپنے نفس پر دوسروں کو ترجیح دی ہوگی اور دوسرے کے فرائض ادا کیے ہوں گے' انہی کے لیے فلاح ہے)

آج کی جدید حیاتیات اور Arthropology کی تحقیقات کا نتیجہ سامنے آیا ہے کہ انسان کی عقل کا آغاز اس وقت ہوا' جب اس نے جبلی اقدار کے خلاف لڑنا شروع کیا۔ جب انسان اس تجربے سے گزرا اور جوں جوں اس کے تفکر' تعقل اور شعور نے ارتقائی منزلوں کو طے کیا' اس کی یہ لڑائی شدید تر ہوتی گئی۔ اس دوران اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی رہنمائی میسر رہی۔ اہل مذہب یہ سمجھتے ہیں کہ انسان Planted ہے اور دوسرے لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ انسان کی تخلیق و ارتقاء ایک Natural Procedure ہے۔ کوئی علم اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ اس سوال کو حل نہیں کر لیتا۔ چونکہ اس کا حل صرف میسر ذرائع سے ہی ممکن نہیں ہے۔ سو انسان کی Colonial Plantation کا پورا پورا حل ہمیں تب ملتا ہے' جب ہم خدا کی طرف دیکھتے ہیں۔

نوحؑ نے 950 سال تک اپنی قوم کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وحدت کا پیغام رکھا مگر معاشرے کی طرف سے آپ کو مثبت Response نہ ملا کیونکہ ابتدائی انسان کی جبلت اس میں حائل تھی۔ جبلت ہی کی اس جنگ میں آپ کا بیٹا بھی چلا گیا۔ اتنا طویل عرصہ تک تبلیغ کے باوجود آپ کو صرف چند افراد ہی ایسے ملے جنھوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا اور اسے قبول کیا۔ کیا آپ کی دعوت میں نقص تھا؟ پیغام موثر نہ تھا؟ دراصل اس کا سبب یہ تھا کہ لوگ مضبوط ترین جبلی گرفت میں تھے جو انہیں راہ نبوت پر آنے سے روکتی تھی۔ اگرچہ

اس امت پر اتنا زیادہ بوجھ نہ ڈالا گیا تھا مگر صرف دعوت توحید کو قبول کرنا بھی ان لوگوں کو گوارہ نہ تھا۔ آج اگر ہمیں اس طرح کی دعوت دی جائے کہ صرف خدا کو واحد مانو اور کام چھوڑ دو تو ہم جشن منائیں مگر ہم پر اس کے سوا بھی قوانین الٰہی کا بوجھ ہے جبکہ اس وقت ایک قانون بھی لوگوں سے برداشت نہ ہوتا تھا۔ چونکہ شعور کا ارتقاء مکمل نہ ہوا تھا' اس لیے اس کے لیے آنے والا Message بھی مکمل نہ تھا۔

اس کے بعد تاریخ کی ایک بڑی شخصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جن کے کردار کی عظمت اور مثالی ہونے کو قرآن یوں بیان کرتا ہے:-

ان ابراھیم لحلیم اواہ منیب (۱۱:۷۵)

ترجمہ:- بے شک ابراہیم بڑے بردبار' رقیق القلب اور ہر وقت خدا کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

آپ کی عظمت کو رب ذوالجلال نے بیان کیا اور آپ کی کوئی ادا اتنی پسند آئی کہ آپ کو رب ذوالجلال نے خلت کے مقام پر فائز کیا۔ آپؑ نے اللہ کی تلاش کے لیے عقل کو کمال احسن طریقے سے استعمال کیا۔ آپ کی تلاش حق کے طریقے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں استدلال' استنباط اور استخراج کے رویئے پیدا ہونے شروع ہو گئے اور انسانی ذہن کتنا Mature ہو گیا۔ وہ انسان جو جانوروں کی سطح سے اٹھا تھا' اس سے ایک Top Intellectual پیدا ہوا جو ہر معاملے میں چھان بین اور تحقیق کر رہا تھا۔

فلما را الشمس بازغۃ قال ھذاربی ھذا اکبر فلما افلت قال یقوم انی بری مما تشرکون انی وجھت وجھی للذی فطر السموت والارض حنیفا وما انا من المشرکین0 (۶:۷۸'۷۹)

ترجمہ:- پھر جب آپ نے سورج کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا (کیا) یہ میرا رب ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے' پھر جب وہ غروب ہو گیا تو بول اٹھے' اے میری قوم میں ان سب سے جن کو تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو' بیزار ہوں۔ میں نے تو اپنا منہ اسی ذات کی طرف یکسو ہو کر کر لیا جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

یعنی تمام امکانات کو سامنے رکھ کر ابراہیمؑ اس نتیجے پر پہنچے کہ خدا لازوال ہونا چاہیے۔ اب انسان عموم (General) سے خصوص (Particular) کی طرف آ رہا تھا۔ اب استقرائی اور استخراجی منطق کی تکمیل ہو رہی تھی اور یہ عمل حضرت ابراہیمؑ کے ذریعے تکمیل پا رہا تھا

کیونکہ پیغمبر سے زیادہ ذہین اس کے دور میں کوئی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے زمانے میں تمام حکومتیں Theocratic ہوتی تھیں یعنی مذہبی لوگ ہی حکمران بھی ہوتے تھے اور رہنما بھی۔ پیغمبروں کو حکمت اور حکم دونوں چیزیں عطا ہوتی تھیں۔ اسی لیے حضرت ابراہیمؑ کے لیے فرمایا گیا:-

واذا بتلی ابراهیم ربه بکلمت فاتمهن قال انی جاعلك للناس اماما (۲:۱۲۴)

ترجمہ:-اور (یاد کرو) جب حضرت ابراہیمؑ کو ان کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو وہ پورے اترے تو اللہ نے فرمایا' میں تم کو سب لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔

یعنی جب رب ذوالجلال نے آپ کو آزمالیا اور مطلوبہ Test سے گزار لیا تو پھر آپ کو نسل انسانی کا امام بنایا۔ وہ بنیادی خصوصیت جس کی بنیاد پر ابراہیمؑ کو امام بنایا گیا' وہ شعور و عقل کی گراں مایہ دولت تھی جو اللہ نے انسان کو عطا کی اور یہی انسان کو بنانے کا مقصد تھا جس کے لیے ہدایت آتی رہی کہ انسان ہدایت ربانی کی بنیاد پر اپنی عقل اور شعور کو استعمال کرے اور اسے حضرت ابراہیمؑ نے اتنی Skill کے ساتھ استعمال کیا کہ دنیاوی مظاہر سے آپ ذات باری تعالیٰ تک جا پہنچے۔ آپ کے ہی زمانے میں حضرت لوطؑ بھی تھے مگر آپ کی قوم میں بدبختی جاری تھی کیونکہ قوم لوط میں Animal Behaviour کی گرفت مضبوط تھی اور جب وہ اس گرفت سے نکلنے پر تیار نہ ہوئے تو رب ذوالجلال نے اس قوم کو نشان زدہ پتھروں سے تباہ و برباد کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ تمام پسماندہ قومیں تباہی سے دوچار ہوئیں۔ کسی کو مسخ کر دیا گیا اور کوئی طوفان اور زلزلوں کی نذر ہو گئی کیونکہ تباہ ہونے والی قومیں جانورانہ جبلت کی طرف مائل تھیں۔ عقل سے کام نہ لینے کی وجہ سے ان پر ہر نوع کی نصیحت بے اثر اور ناکارہ تھی اور انہوں نے معاشرے میں بطور انسانی رویہ کے اپنی نااہلیت ظاہر کر دی تھی۔ تعقل' تفکر اور الوہی پیغام کو قبول نہ کر کے انہوں نے Total Failure ریکارڈ کر دی تھی اور اللہ کے پاس ان کی تباہی (Elimination) کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اگرچہ اب بھی اس نوع کی گمراہیاں نظر آتی ہیں مگر اس زمانے میں اقوام کو پہلے کے طرح عذابوں سے نہیں تباہ کیا جاتا۔ اگرچہ اب عادات جانورانہ ہیں مگر عقل و شعور Mature ہے۔ اس لیے توقع رکھی جاتی ہے کہ کہیں نہ کہیں یہ اپنی روش بدل لے گا۔

اس کے بعد موسیٰؑ کا زمانہ آیا ہے۔ آپ کا زمانہ 1170BC کا زمانہ ہے۔ آپ نے ایک گری پڑی قوم کو عزت سے آشنا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اگرچہ قوم موسیٰؑ میں عقل و تفکر نظر آتا

ہے مگر اس کا استعمال تلاش حق کے لیے وہ کم ہی کرتے تھے۔ عقل و فکر کے ہوتے ہوئے بھی وہ تعقل سے عاری اور جبلت سے مغلوب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہیں موسیٰؑ کی طرف سے کچھ احکامات دیئے گئے تو انہوں نے عقل کو اسی نہج پر استعمال کیا جہاں ان کے نفس کی ضرورت پوری ہوتی تھی:-

ولقد علمتم الذين اعتدوا منكم فى السبت فقلنا لهم كونوا قردة خسپين O (۶۵:۲)

ترجمہ:-اور اے یہود (تم ان لوگوں کو خوب جانتے ہو۔ انہوں نے ہفتہ کے دن زیادتی کی تھی (یعنی ہفتہ کا دن عبادت کے لیے تھا' اس دن مچھلی کا شکار منع تھا۔ انہوں نے حیلہ سے اس دن شکار کرنا شروع کیا اور عدول حکمی کی) تو ہم نے ان سے کہا تم ذلیل بندر ہو۔ (پھٹکارے ہوئے)

اسی طرح جب انہیں یروشلم میں داخلے کا حکم ملا۔

واذ قيل لهم اسكنوا هذه القرية وكلوا منها حيث شئتم وقولوا حطة وادخلوا الباب سجدا نغفر لكم خطيئتكم سنزيد المحسنين O فبدل الذين ظلموا منهم قولا غير الذى قيل لهم فارسلنا عليهم رجزا من السماء بما كانوا يظلمون (۱۶۱:۷'۱۶۲)

ترجمہ:-اور جب ان کو حکم ہوا کہ اس شہر میں جا بسو اور جہاں سے چاہو کھاؤ اور حطۃ کہتے ہوئے اور سجدہ کرتے ہوئے شہر کے دروازوں سے داخل ہونا تو ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور نیکو کاروں کو اس سے بھی زیادہ دیں گے۔ پس ان میں سے ظالموں نے جو بات ان سے کہی گئی تھی' اس کو بدل ڈالا۔ پس ان کی حکم عدولی پر ہم نے ان پر آسمان سے عذاب نازل کیا کیونکہ وہ حد سے بڑھ گئے تھے۔

یعنی اس کے باوجود کہ انہیں ایک محفوظ شہر عطا کیا گیا۔ ان کی اولاد کو قتل ہونے اور انہیں Elimination سے بچایا گیا' انہوں نے کلمات شکر کو حطۃ سے بدل دیا اور سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے۔ گویا وہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اپنی ذہانت سے انہوں نے خدائی قانون کو Exploit کیا۔ اسی طرح جب انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے اسے تمسخر اور مذاق بنا لیا۔

واذ قال موسى لقومه ان الله يامركم ان تذبحوا بقرة قالو اتتخذنا هزوا

قال اعوذ باللہ ان اکون من الجھلین (۲:۶۷)

ترجمہ:-اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم ہم سے ہنسی کرتے ہوئے۔ موسیٰؑ نے فرمایا اللہ کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوں۔

یہی نہیں بلکہ اس قوم میں اور بھی بڑے عیب تھے۔ وہ الزام جو خود رب ذوالجلال نے ان پر لگائے' وہ قتل انبیاء اور تحریف کتاب تھے۔

وباء و بغضب من اللہ ذلک بانھم کانوا یکفرون بایت اللہ ویقتلون النبیین بغیر الحق (۲:۶۱)

ترجمہ:-اور وہ اللہ کا غصہ لے کر پھرے اور یہ سب اس لیے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔

افتطمعون ان یومنوا لکم وقدکان فریق منھم یسمعون کلام اللہ ثم یحرفونہ من بعد ماعقلوہ وھم یعلمون (۲:۷۵)

ترجمہ:-کیا اب تم توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مانیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سنتا تھا اور پھر اسے جان بوجھ کر بدل ڈالتا تھا اور وہ خوب جانتے تھے کہ اللہ کی طرف سے کیا اترا ہے اور اس کا منشاء کیا ہے؟

قوم موسیٰؑ ظاہری عبادات میں تو بڑی پکی اور باکمال تھی۔ اندرونی جذبات واحساسات سے یہ قوم بالکل عاری تھی۔ سوائے چند ایک جو انبیاءؑ کی پیروی کرنے والے تھے' اس کی وجہ یہ تھی کہ اب تک انبیاءؑ کے ذریعے جو Dictation دی جارہی تھی' وہ Outer Life سے ہی متعلق تھی۔ اس کی نوعیت کلیتاً خارجی تھی۔ اب یہ فیصلہ ہوا کہ انسانیت کو اندرونی کیفیات کی تعلیم بھی دی جائے۔ اب صرف Objective Realties پر ہی متوجہ رہنے کی بجائے اللہ نے اگلا قدم اٹھایا اور ایک ایسا پیغمبر بھیجا جنہوں نے اندرونی تعلیم دی جنہوں نے Internal Conflicts کے حل کے لیے دین کا داخلی تصور پیش کیا۔ یہ حضرت عیسیٰؑ تھے۔ آپ نے کوئی شریعت نہیں پیش کی بلکہ آپ کے تمام اقوال وفرامین کا تعلق انسان کی داخلی کیفیات سے ہے۔ مثلاً یہ کہ کوئی آپ کے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی اس کے سامنے رکھ دو۔ یا یہ کہ ہمسائے کی بیوی کو بری نظر سے دیکھنا بھی زنا ہے۔ ان سب کا مقصود یہ تھا کہ اندر کا Aggression ختم ہونا چاہیے۔ یہ وہ احکامات تھے جن کے لیے کچھ دیر سوچنا پڑتا تھا۔ پھر

ان میں سے کچھ لوگ افراط و تفریط کا شکار ہو گئے اور وہ رہبانیت کی راہ پر چل پڑے۔ حالانکہ پوری کی پوری زندگی کو رہبانیت کی نذر کر دینا مسئلہ کا حل نہ تھا۔

اب خدا نے انسان کے بارے میں سوچا کہ پہلے جو بھی حکم دیا جاتا ہے' وہ افراط و تفریط کی وجہ سے مطلوبہ نتائج تک نہیں لاتا۔ تاہم ایک مثبت پہلو بھی تھا کہ اب انسان کی Capacity of Brain اور سوچنے و سمجھنے کی صلاحیتیں کافی بڑھ چکی تھیں یعنی اب انسان اس قابل ہو چکا تھا کہ خدا اپنے پیغام کو مکمل کر دیتا کہ انسان میں جبلی و عقلی شعور کا مکمل توازن پیدا ہو جاتا اور انسان اب اصول کائنات کے ساتھ ساتھ رب کی ہدایت کے تحت زندگی گزار سکتا۔

انا ھدینه السبیل اماشا کِراً واما کفوراً (۳:۷٦)

ترجمہ:- ہم ہی نے اسے راہ حق دکھادی' خواہ وہ شکر گزار ہو یا ناشکر گزار (دونوں کی راہیں الگ الگ ہیں)

اب رب ذوالجلال نے اعلان فرمایا:-

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (۳:۵)

ترجمہ:- آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر میں نے اپنی نعمت پوری کر دی ہے اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا ہے۔

اس آیت میں دو چیزوں کا تذکرہ ہوا۔ دین اور نعمت۔ دین سے مراد Objective Truth ہے اور نعمت سے مراد حاصل انسانیت اور خلاصہ ہدایت حضرت محمد ﷺ ہیں۔ جس طرح زمانے میں بہترین عقل پیغمبر ہی کی ہوتی ہے' اسی طرح آنے والے تمام زمانوں میں بھی جبکہ انسانی عقل اور تفکر کا ارتقاء جاری رہے گا' حضرت محمد ﷺ کے تعقل کا درجہ بلند تر اور برتر ہی رہے گا اور آپ کی تعلیمات بھی ہمیشہ آنے والے زمانوں کے لیے ایک نعمت رہیں گی جس طرح بودلیئر نے کہا:

"Writer's every word is an act of generousity."

کہ ادیب کا ہر لفظ معاشرے کے لیے ایک فیاضی ہے۔

آپؐ نے پوچھا' سب سے زیادہ فیاض کون ہے؟ صحابہ کرامؓ نے فرمایا' اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ فیاض وہ ہے جس نے علم سیکھا اور

دوسرے کو سکھایا یعنی فیاضی کا وہ مفہوم جو آج کے مفکر لے رہے ہیں، پیغمبر السلامؐ نے صدیوں پہلے دے دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ آپ نے علم کی بھی تعریف کی کہ وہی علم فلاح ہے جو با مقصد ہو۔ آپ نے فرمایا:

اللهم انی اعوذبك من الدعا لایسمع و من العلم لاینفع

ترجمہ:-اے اللہ، میں اس دعا سے پناہ مانگتا ہوں جو سنی نہ جائے اور اس علم سے پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے۔

وہ علم جو نفع کثیر عطا کرتا ہے اور حقیقی علم کے درجہ کا حامل ہے، وہ خدا کی شناخت عطا کرنے والا علم ہے۔ جو بندگی کی حالت پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں۔

انما یخشی الله من عباده العلمٰوء (۲۸:۳۵)

ترجمہ:-بے شک علماء ہی وہ لوگ ہیں جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرتے ہیں۔

آپؐ کے اسی منصب علمی کی وجہ سے آپ ہر آنے والے دور میں چاہے اس میں انسانیت علم کی کتنی ہی منزلیں کیوں نہ طے کر لے، سب سے زیادہ صاحب علم ہوں گے۔ احادیث کے وسیع ذخیرے میں کئی ایسی احادیث ہیں جو اس امر پر گواہ ہیں کہ انسانی عقل و شعور نے ابھی تک ان کے مفاہیم تک کو بھی مکمل طور پر نہیں سمجھا۔

آپؐ نے ابوذرؓ سے پوچھا۔ اے ابوذرؓ سورج کدھر جاتا ہے؟ ابوذر نے فرمایا **والله و رسوله اعلم** آپ نے ارشاد فرمایا کہ سورج غروب ہونے کے بعد عرش بریں کو جاتا ہے۔ اس حدیث پر کئی معترضین نے اعتراض کیا کہ سورج کا عرش بریں کی طرف جانا ناقابل فہم ہے اور اسے حدیث ہی تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ حالانکہ حدیث سے انکار کے بجائے انہیں اپنے کم علم کا اعتراف کرنا چاہیے تھا۔ آج کی سائنسی تحقیق اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ سورج کی گردشیں تین طرح کی ہیں:

1- سورج ایک گردش ۱۸ کروڑ سال میں کہکشاں کی طرف مکمل کرتا ہے۔

2- سورج کی دوسری گردش 150 میل فی سیکنڈ کی رفتار سے Solar Epic کی طرف ہے، جسے عرش کرتے ہیں۔

3- اور سورج کی تیسری حرکت وہ ہے جس کا ہم شب و روز مشاہدہ کرتے ہیں۔

اس حدیث اور اس نوع کی دیگر احادیث کو متشابہات حدیث کہا جا سکتا ہے۔ ان کا

متشابہات قرآن سے فرق یہ ہے کہ قرآن کے متشابہات میں زبان کا Pattern نہیں بدلتا۔ مثلاً و جعلنا من الماء کل شی حی میں لفظ کی تاویل نہیں بدلے گی، تاہم معانی کی تعبیر ہر دور میں جدید تر ہوتی جائے گی۔ مثلاً یہ آیۃ مبارکہ:۔

اولم یر الذین کفروا ان السموات والارض کانتا رتقا ففتقنھما وجعلنا من الماء کل شی حی افلایومنون (۲۱:۳۰)

ترجمہ:۔ کیا جو لوگ کافر ہیں، انہوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ آسمان و زمین ملے جلے تھے۔ پھر ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی تخلیق کیا۔ پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔

ان آیات کا معنی ہر دور میں ارتقاء پذیر ہوتا رہے گا، لفظ میں تغیر نہیں ہوگا اور فہم علوم میں کمی کی وجہ سے لفظ کی تعبیر نہیں بدلے گی مگر حدیث کے متشابہات میں فرق ہے کہ آپ کو جو زبان عطا کی گئی، اس کی Eternal Shape نہیں ہے۔ جس طرح آپ نے معراج کے واقعات کے باب میں ارشاد فرمایا کہ مجھے جبریل امین ام ھانی کے گھر سے لائے، پھر براق پر بٹھایا۔ پھر اسے اشارہ کیا اور اس کے پاؤں سے شعلے نکلے۔ براق سے کیا مراد ہے؟ یہ اس زمانے کے محاورے کا لفظ ہے تاکہ اس دور کے لوگوں کے سامنے مفہوم واضح ہو سکے۔ اسے سمجھنا ہمارا کام ہے کہ اس زمانے میں آپ کے ادا کردہ الفاظ کا مفہوم متعین کریں۔ ایک حدیث کو بنیاد بناتے ہوئے میں نے کہا تھا:

Human Being will be able to create exact replica of Human Being.

تو مجھ سے پوچھا گیا کہ میں نے کس حدیث کو بنیاد بناتے ہوئے یہ استنباط کیا۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: عصر دجال میں دجال مردہ کو زندہ کرے گا۔ پوچھا گیا، کیا وہ وہی شخص ہوگا تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ اس کی مثال ہوگا۔ یہی کلوننگ ہے جس کے متعارف ہونے سے چھ ماہ قبل سیالکوٹ میں میں نے اس کا تذکرہ کیا تھا۔ جب تک ہم Rigid محاورے سے نکل کر High Intellctual Capacity کے مطابق سوچنے کی کوشش نہیں کریں گے، ہم آپؐ کے فرامین کو کماحقہ نہیں سمجھ سکیں گے۔ سب سے بڑی سنت علم سیکھنا ہے۔ اگر علم نہیں ہوگا تو اتنے بڑے کائناتی Intellectual کی بات کو سمجھنا کس طرح ممکن ہوگا؟

جب آپ کی حدیث مبارکہ لاتسبوا الدھر ان الدھر ھو اللہ دور حاضر کے ایک

بڑے فلسفی برگساں کے سامنے پڑھی گئی تو اپاہج ہونے کے باوجود وہ اچھل پڑا اور اقبالؒ سے کہنے لگا:-

I swear that your Prophet was a Prophet

یعنی ایسا علم صرف خدا ہی دے سکتا ہے۔ وہ خود اس طرح کی بات نہیں کہہ سکتا۔ میں 30 برس سے اس مسئلے پر غور کر رہا ہوں مگر میں زماں و مکاں کے اس فلسفے تک نہیں پہنچ سکا۔

ایک اور حدیث کے مندرجات بھی بادی النظر میں محل نظر ٹھہرتے ہیں جس کے مطابق صحابہ کرامؓ کو اس وقت نقصان اٹھانا پڑا جب انہوں نے حضور گرامی مرتبتؐ کے فرمانے پر کھجور کے پیوند نہ لگائے تو ان کی پیداوار میں نقص واقع ہوا مگر یہاں بھی عقل کے کئی دروازوں کی کشادگی کا سامان موجود ہے۔ اس کے پس پردہ اس استاد عظیم نے تھوڑی سی ملامت عقلی دے کر انسانیت کو ایک ابدی سبق دیا کہ جو بڑے بڑے روحانی دعویدار ہیں' انہیں انسانی تجربے پر فوقیت نہ دینا کیونکہ تجربہ کمال کو تب پہنچتا ہے جب اس کے پیچھے پوری زندگی کا پس منظر اور جدوجہد ہوتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی Advice ہے کہ ایک بزرگ جو کسی میدان کا Specialist نہیں ہے' اس میں وہ رائے زنی کرتا ہے اور وہ صائب نہیں تو اس سے مذہب کے پورے Institution سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔

ایک اور حدیث جس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ جس نے آذان سننے کے بعد لاحول کہا' اس پر جنت واجب ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟

مگر وہ لاحول جس کی ادائیگی سے جنت کا وجوب عمل میں آتا ہے' اتنا آسان نہیں۔ یہ تو ایک شعوری کاوش ہے جہاں تقدیر اور تدبیر باہم ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ جب بندہ شعوری طور پر کہتا ہے۔

"مجھے کچھ اختیار اور قوت حاصل نہیں ہے مگر اللہ ہی کی تائید و نصرت سے۔"

یہی وہ لمحہ ہے جب بندہ عبادت کا حق ادا کرتا ہے مگر یہ شعوری کوشش اتنی آسانی سے ممکن نہیں ہوتی۔ تقدیر کی اہمیت یہ ہے کہ اگر کوئی تقدیر الٰہی کا قائل نہیں تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ تقدیر اور توفیق باہم ساتھ ساتھ ہیں۔ توفیق انسان طلب کرتا ہے جبکہ تقدیر اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ تقدیر کی کوئی وضاحت پیغمبرانہ درجہ استدلال تک نہیں پہنچ سکی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"کام کرو جو اللہ نے تمہارے لیے مقدر کر دیا ہے' وہ سہل کر دیا ہے۔" یعنی اس میں انسان کی جبلی و شعوری کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر تقدیر کے بارے میں اور کوئی دلیل نہ بھی ہوتی تو اس کے لیے یہی کافی تھا کہ کوئی شخص بھی اپنا گھر' مقام پیدائش' ماں باپ اور موت کو نہیں چنتا ورنہ ہر غریب بچہ چاہتا کہ وہ بل گیٹس کے گھر پیدا ہو۔ ہر قتل ہونے والی بچی اپنے والدین کے گھر سے گریز کر لیتی یعنی تقدیر و تدبیر ساتھ ساتھ ہیں اور یہ کہ تقدیر کو ماننے سے بے عملی نہیں پیدا ہوتی بلکہ انسان کی فاعلیت اور اہلیت بڑھ جاتی ہے کہ اللہ نے مجھ سے ایک کام لینا ہے تو بندہ اس کے لیے تیار رہتا ہے۔

ایک اور حدیث جو عصری شعور پر آپؐ کے تفکر و تعقل کی ابدی برتری کو بیان کرتی ہے' وہ حدیث ابن صیاد ہے۔ جب ابن صیاد کے بارے میں آپؐ کو اطلاع دی گئی تو آپؐ اسے دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ آپؐ اس جگہ گئے جہاں ابن صیاد تھا اور اس کے پیچھے کھڑے ہو کر اس کا کلام سننے لگے کہ دریں اثناء اس کی ماں کے شور نے اسے آپؐ کی طرف متوجہ کر دیا۔ آپ نے ابن صیاد کی ماں سے فرمایا' اگر تو مجھے اس کی بات سننے دیتی تو میں اس کا مرض پا لیتا یعنی آپ کائنات انسان کی وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے تحلیل نفس کا طریقہ دیا۔ آج بھی تحلیل نفس اسی طرح Data Collection پر انحصار کرتی ہے۔

ایک اور حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان کا عرش پانی پر ہے۔ شام کو اس کا اجلاس ہوتا ہے۔ اس کے تمام چیلے اس کے سامنے اپنی دن بھر کی کارگزاری پیش کرتے ہیں۔ جب کوئی اس بات کی اطلاع لاتا ہے کہ اس نے میاں بیوی کے درمیان فرق کروا دیا ہے تو وہ اسے اپنے پاس اپنی مسند پر جگہ دیتا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ میاں بیوی کے درمیان بہت سے مسائل کی وجہ سے ان کی باہمی Understanding کا نہ ہونا ہے اور پھر یہ کہ ایک خاوند اور بیوی کی ناراضگی پورے معاشرے کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔ اس سے ناراضگیاں اور اختلافات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ آپؐ نے معاشرے کو درپیش مسائل کی ترجیحات میں اسے اتنا بڑا مسئلہ قرار دے کر اس کی طرف کتنا پہلے اشارہ کر دیا۔ اسے کوئی ماہر عمرانیات (Socialogist) ہی Evaluate کر سکتا ہے۔

انسانی معاشرے کی تشکیل میں اجتماعی رائے کی کتنی زیادہ اہمت ہے' اسے بھی آپ نے کمال موثر طریقے سے بیان کیا۔ ارشاد فرمایا کہ شیطان انسانوں کا بھیڑیا ہے۔ اجماع امت سے گریز کرنے والوں کو شیطان اچک لے گا۔ انسان کا انفرادی شعور محدود ہوتا ہے جبکہ اجتماع کا

شعور Collective Opinion ہوتا ہے۔ جو معاشرے کی رہنمائی کے لیے بہترین رائے ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میری امت کا اجماع کبھی غلط نہیں ہوتا یعنی امت کی اجتماعی بقاء کو اجماع میں قیام پذیر ہونے کو قرار دیا گیا۔

انسان کی نفسی اصلاح کے حوالے سے ایک انتہائی وسیع المفہومی حدیث ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اگر تم اپنی جانوں پر سختی کرو گے تو اللہ بھی سختی کرے گا۔ اگر اعتدال اختیار کرو گے تو اللہ بھی تمہارے ساتھ یہی سلوک کرے گا۔ یہی انسانیت کا ارتقاء ہے کہ انسانیت کروڑوں سال کی مسافت طے کر کے محمد رسول اللہؐ تک پہنچی مگر ہم اعتدال کا دامن چھوڑ کر ۱۰سو سال میں آپؐ کی تعلیمات سے انصاف نہیں کر سکے۔ ہمیں ایمان کامل کے حصول کے لیے اپنی بنیادی تعقل کے Milestone کو بدلنا ہوگا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اللہ کے لیے محبت کی، اللہ کے لیے نفرت کی، اللہ کے لیے منع کیا اور اللہ کے لیے ہی کسی عمل کو اختیار کیا، اس نے ایمان کامل حاصل کر لیا۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے۔ اس کے بعد آسانی ہے۔ ظاہری زندگی کا سارا سفر قبر تک ہے۔ زندگی کے جملہ اعمال و احوال کے بارے سوال قبر میں جا کر ہوگا۔ اگر ہم اس ظاہری زندگی میں Clarities حاصل نہیں کریں گے تو قبر میں جواب نہ دیئے جا سکیں گے۔ جب اللہ اور رسولؐ کے بارے سوال ہوگا اور بندہ جواب نہ دے پائے گا تو ارشاد ہوگا، یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اسے ہم نے پورا کلام (قرآن) عطا کیا۔ رسولؐ بھیجا، زندگی کی ہر سہولت بخشی اور رسول اللہؐ نے ایک Intellectual Priority انسانوں تک پہنچائی جسے قرآن نے ان کے سامنے رکھا۔ اس طرح ہر ذہین آدمی قرآن پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ قرآن الوہیت کو بیان کرتا ہے۔ چونکہ اس نے اس ترجیح اولیٰ کو نظر انداز کیا، سو اسے حوالہ عذاب کر دیا جائے۔

آج ہمیں راہ اعتدال کی طرف لوٹنا ہوگا۔ راہ اعتدال سے انحراف ہی یہودی ذہنیت ہے۔ راہ اعتدال سے ہی ہم اپنی ترجیحات کا صحیح تعین کر کے زندگی اس ترجیح اولیٰ کو دے سکیں گے جس کی شناخت میں ہماری دنیوی اور اخروی فلاح ہے اور جو مقصود ہے بعثت محمد رسول اللہ ﷺ کا۔

وما علینا الا البلاغ ○

خطبہ پنجم

نظریہ جمال پروردگار

رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق و اجعل لی من لدنك سلطنا نصیرا (۱۷:۸۰)

جمالیات کا عنوان بظاہر تو حسن و جمال ہے مگر اس پر گفتگو اتنی حسن و جمال سے پر نہیں بلکہ کئی پیچیدہ مباحث پر مشتمل ہے۔ یوں تو بے شمار موضوعات ہیں مگر قریباً قریباً دنیا بھر کے فلاسفر مشرق و مغرب نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے اور اگر جمالیات کے موضوع کو Technically پر کھا جائے اور اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو شاید عام آدمی حسن سے ہی بیزار ہو جائے۔ جمالیات کا اصل مطلب ہے گفتگوئے اظہار۔ ذہنوں کے مابین گفتگو۔ یہ حسن و ذوق کے مطالعے کا نام ہے۔ اس کی وضاحت اس لیے دشوار ہے کہ یہ ذہن انسانی کے اختلافی درجات کی طرح فرد سے فرد اور قوم سے قوم جدا ہوتا ہے۔ ایک ہی انسان میں بلوغت فکری سے بدلتی ہوئی معاشی و معاشرتی صورتحال میں کم و بیش اور بلند و پست ہوتا رہتا ہے۔ حسن و ذوق کے مختلف انداز، مختلف حالات میں، تعیش میں، جبر میں، قدر میں، فراخی میں، بخیلی میں جمالیات اپنا انداز جدا کر لیتی ہے۔ کبھی افادیت کا پہلو اس کی ناگزیریت پر غالب آجاتا ہے، کبھی محبت افادیت پر غالب آجاتی ہے۔ کبھی جذبہ سائنس اور فکر کو جھٹلا دیتا ہے، کبھی تقلید شخص اجتہاد کو نامنظور کر دیتی ہے۔ کبھی معاشرتی رجحانات معاشی وجوہات پر غالب آجاتے ہیں اور کبھی غم دوراں غم جاں پر غالب آجاتے ہیں۔

جمالیات صورت، بد صورت اور بے صورت کی تصویر کشی ہے۔ یہ پست و بالا، بدتر و بہتر، اعلیٰ و ادنیٰ کی تعریف ہے۔ یہ ذوق کی تنقید ہے۔ فنون لطیفہ کا بیاں ہے۔ یہ غور و فکر کی ہم آہنگی ہے اور توازن ہے۔ یہ محسوس کی جانے والی اشیاء کا مس ہے اور غیر محسوس کا ادراک ہے۔ یہ حسن و لطافت کا تذکرہ ہے۔ رنگ و نور کا بکھراؤ ہے۔ یہ معبد شمس کے خداوند رع کی نقاشی ہے۔ یہ قدیم انسان کا طرز تکلم ہے۔ نینوا اور بابل کے آویزاں باغ ہیں۔ یہ جنت

شداد کے نقوش ہیں۔ گلگامش اور انکدو کی داستان کے اوراق کی وضاحت ہیں۔ اجنتا اور الورا کے جنسی اور روحانی ترفع کی داستان ہیں۔ جمالیات ہی وہ واحد موضوع ہے جس نے فطرت کی ہولناک اور ناقابل تسخیر صلاحیتوں کے جواب میں سپین کے منقش غار میسوپوٹیما کے احرام (Pyramids)' بابل و نینوا کے کتبات (Epitaph) اور انطاقیہ اور حمص کے مندر و دیوات پیدا کیے اور ہڑپہ و موہنجودڑو کی تخلیق وزیبائش کے اسباب پیدا کیے۔

جمالیات وہ صلاحیت شوق ہے جو حسن و عشق کا سنگ بنیاد ہے' مدافعت ہے' ارتقائے زندگی ہے' فردوس گم گشتہ ہے۔ درد و سوز کی منزل ہے۔ رنگ انگشت حنا ہے۔ قوس قزح ہے۔ علم کتاب ہے۔ دل کے دھڑکن کی سرگوشی ہے۔ پہاڑوں سے گرتے ہوئے جھرنوں کی صدا ہے۔ بکھرے ہوئے جلووں کی آواز ہے۔ یہ نغمہ سکوت صحرا ہے۔ نغمہ و سرود کی ہیجان انگیز تال ہے۔ یہ زندگی کے وجود بقا سے متعلق ہے۔ جمالیات کی پسی طین لازب ہے۔ صلصال کالفخار ہے۔ اس کی بلندی جمال پروردگار ہے۔ حسن عارضی و پسماندہ دنیا ہے۔ حسن ازل و ابد ماورائے افلاک ہے۔ یہ کائنات پست و بالا کی ترتیب و تدوین ہے اور بین الاقوامی فلسفہ وجود و شھود ہے۔ اس کے باوجود کہ یہ جمالیات کی تعریف ہے' ہر ذہن یہ حق رکھتا ہے کہ اس میں کمی و بیشی کرے۔

اب ہم اس موضوع پر آتے ہیں کہ دنیا بھر کے جمالیاتی مفکروں نے اس موضوع پر کیسے غور و فکر کیا؟

ہمارے پاس جو قدیم ترین تہذیب ہے' وہ ہندوستان کی ہے۔ قبل از اسلام ہندوستان میں حسیات کی دنیا کو محض مایا' فریب اور دھوکہ سمجھا جاتا تھا۔ تمام ہندو فلسفہ میں جمالیات کو تین لفظ بیان کرتے ہیں۔ مایا۔ کرما۔ رسا جسے اب رس کہا جاتا ہے۔ اس طرح مایا اور کرما کے تصور نے مل جل کر ہندوؤں کے عقائد اور جمالیات کے تصور پر گہرا اثر مرتب کیا حتیٰ کہ کرشنا کے گرد و پیش جنسی اور جسمانی طاقتوں کے مظاہر کو کثرت سے ہندو مندروں میں اجاگر کیا گیا۔ جنسی بلوغت اور Sexual Presentation کے ساتھ ساتھ یہ نجات کے پہلو کو نمایاں کرتے تھے۔ دراصل ہوا یہ کہ کرما کا انجام کار کا جو فلسفہ تھا' جس میں ہندو اس بات کا قائل تھا کہ جس نے اچھے کام کیے' اس کی مکتی ہے اور جس نے اچھے کام نہ کیے' اسے دوبارہ زندگی میں آنا پڑتا ہے۔ اس طرح ان کے حیات کے فلسفہ پر کرما کا گہرا اثر پڑا۔ جس شخص کے نام پر ملک بھارت کا نام بھارت پڑا' وہ رشی بھارت تھا۔ وہ جمالیات کا سب سے پہلا اور بڑا

فلاسفر تھا۔ اس نے تصورِ رقص دیا۔ اس نے تصور دیا کہ انسانی جبلت میں کچھ خصوصی آثار موجود ہیں۔ جس طرح انسانی جذبوں میں خوشی ہے' مسرت ہے' ہنسی ہے' غم و غصہ ہے' نفرت ہے' اس کے بالکل برعکس اس کی جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں' وہ ترحم ہے' تشدد ہے' مسکراہٹ ہے' غضب و غصہ ہے۔ اس طرح شاندار اور اثرانگیز کلمات کو ڈھال کر انہوں نے اپنے فلسفہ کو مرتب کیا۔

چین میں بہت سے بڑے عظیم استاد پیدا ہوئے' مثلاً کنفیوشس' تاؤ اور ماؤ۔ چین کے عظیم اساتذہ نے جمالیات کو اخلاقی اور سیاسی تعلیم کا اہم جزو قرار دیا۔ انہوں نے اس میں سے فنونِ لطیفہ کو نکال دیا بلکہ کنفیوشس فنونِ لطیفہ کو قطعاً غلط سمجھتا ہے اور الاؤازم یا تاؤازم کے بانیان نے فنونِ لطیفہ کو باعثِ خرابی سمجھا ہے اور جمالیاتی احساس کو ذہن کی بربادی قرار دیا ہے۔ بعد میں زین بدھ نے اس کی طرف کچھ نرمی برتی اور مہاتما بدھ کی تماثیل میں سنگ تراش اور مصوری کو جگہ دی۔ یہ زہد کا رویہ اس وقت تک جاری رہا حتیٰ کہ ماؤزے تنگ کے زمانے میں اور جنگِ انقلاب میں جمالیاتی فکر کو تہ و بالا کر دیا گیا اور بہت ساری Objectivity اور Objective Understanding کے ساتھ حسن کے اس تصور کو جو پہلے سے بدھ مت' تاؤازم یا کنفیوشس ازم میں موجود تھا' اس کو سراسر Negate کر دیا گیا۔

جاپان جو ایک اور قدیم تہذیب ہے' وہاں Chinji کی کہانی لکھی گئی۔ اس میں اس نے جمالیات کو' اعلیٰ ترین ذوقِ حسن کو انسان کی اعلیٰ ترین کوالٹی قرار دیا۔ ۱۳' ۱۴ اویں صدی میں ایک اور بڑے مفکر نے جسے مونوچو کہتے ہیں' حسن کو گہرائی اور پراسراریت کا نام دیا۔ اس نے حسن کی اس طرح تعریف کی کہ حسن گہرائی اور پراسراریت کا نام ہے۔ اس کا خیال ہے ادب اور آرٹس کا ہر اشارہ اور کنایہ خیال سے مطابقت رکھنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال ہے جو بھی حسن کا فن پارہ ذہنِ انسانی کے تصور کے مطابق نہ ہو گا تو وہ ایک خارجی اور ناکام کوشش ہو گا اور اسے ہم فن پارہ یا حسن کا کوئی نمونہ قرار نہیں دے سکتے۔ اٹھارویں صدی میں جاپان ہی کے موری ناگا نے جو بڑے مصنف ہیں' تمام جمالیاتی کاوشوں کو ایک جملے میں یوں بیان کیا:-

"کہ حسن اداس چیزوں کا احساس ہے۔"

اگر اس سارے سلسلے کو دیکھیں تو چینی اور جاپانی جمالیات میں ایک چیز مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہے ترکِ لذات۔ بدھ مت' چینی مفکرین اور جاپان مفکرین نے لذتِ خیال یا جمال

حسن کو جمالیات کا کوئی ایسا حصہ نہیں سمجھا۔ اس کے برعکس انہوں نے جمالیات دراصل اداس چیزوں کے احساس کو قرار دیا۔

دنیا کے نامی گرامی دانشوروں میں سے کوئی ایسا مفکر نہیں گزرا جس نے جمالیات کے موضوع پر غور نہ کیا ہو۔ جس نے حسن کی تحقیق و کشش کی چبھن اپنے سینے میں نہ پائی ہو مگر اس موضوع کا تنوع' اس کا پھیلاؤ' اس کی گیرائی اور گہرائی کا احاطہ ایک انسان کے بس کی بات نہ تھی حتیٰ کہ اس کا ابہام اور اس میں اختلاف رائے کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان نے حسن و جمال کو اور خیالات کو اپنے خیال کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی۔

سقراط کلیٹو (Clito) کے بت خانے میں گیا۔ اس نے اس سنگ تراش کو دیکھا اور اسے کہا۔ بہترین سنگ تراش وہ ہے جس کے مجسمے قلب کے اندرونی جذبات کا بہترین اظہار کرتے ہیں۔ جب تک قلبی احساسات اور خیالات اور قلب کے جذبات تمہارے آرٹ میں داخل نہیں ہوتے' تم کبھی بھی اچھے سنگ تراش نہیں بن سکتے۔ کوئی شخص بھی غیر مرئی حقیقت کی Copy نہیں کر سکتا۔ فن حقیقت کو بعینہٖ پیش نہیں کرتا۔ شاعری ہو یا مصوری یا کوئی اور چیز ہو' کوئی انسان بھی اسے بعینہٖ پیش نہیں کر سکتا۔ دراصل فنکار جو کچھ بھی کرتا ہے' فن کی نقالی کرتا ہے۔ فن نفسیات کی کیفیات کو مصور نہیں کرتا۔ فن افادیت کے بغیر ہے۔ فن سے عقل بہتر ہے۔ سقراط فن کو روحانی اور اخلاقی قیادت کے قابل نہیں سمجھتا۔ سقراط یہاں ایک لفظ بھی حسن کے خدوخال کے بارے میں نہیں کہہ رہا بلکہ اس کا کلام صرف افادیت اور خیر سے متعلق ہے۔ اس کا خیال ہے کہ حسن جو کچھ بھی ہے' عالم ملکوت یا کائنات کی بالائی حقیقت کا عکس ہے۔ جب تک کسی کا فن خیر سے منسلک نہیں ہوگا' اس کی کوئی افادیت نہیں ہے اور وہ ناقص چیز ہوگی۔ اس کے شاگرد افلاطون کو ایک ناز تھا کہ وہ یونانی ہے۔ وہ آزاد ہے اور عہد سقراط میں پیدا ہوا ہے۔

وہ ہندوستان بھی آیا۔ وہ ایک خیالی اور مثالی دنیا اور جمہور کے تصور کا خالق تھا۔ وہ بھی حقیقت مطلقہ کو حسن کہتا ہے۔ وہ تمام اشیاء اور خیالات کو عالم بالا کے ایک دائمی اور ابدی حسن کی دوسرے درجے کی تصویر قرار دیتا ہے۔ وہ خدا کو خیر اور خیر کو خدا سمجھتا ہے۔ وہ سوال کرتا ہے کہ حسن کیا ہے؟ اس کی بنیاد کیا ہے؟ وہ اسے خیر کی کیفیت اور اشیاء کی معروضی صفت اور مادی وجود سے ماورا سمجھتا ہے۔ وہ حسن کو وجود سے بالاتر سمجھتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک نقال اور بے اخلاق حسن کو نہیں پا سکتا۔ اس لیے وہ شاعر کو اپنی جنت ارضی

سے نکال دیتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ادب حسن و جمالیات کی Presentation کا نام ہے۔ اگر ادیب بھی افلاطون کے ہاتھوں چڑھے ہوتے تو اس کی Utopia سے خارج کر دیئے جاتے۔

اس کے بعد تیسرا بڑا استاد پیدا ہوا ارسطو۔ مگر ارسطو نے ان کی رائے سے انحراف کیا۔ اس نے نہ تو حسن کو انائے مطلق سمجھا اور نہ ہی خیر سمجھا بلکہ وہ فطرت کو حسن کہتا ہے۔ وہ حسن کو جبلت، ملکیت اور تصرف سے آزاد حقیقت تصور کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ حسن کے پانچ بنیادی عناصر ہیں۔

1- نظم وضبط (Order)

2- تناسب (Proportion)

3- قطعیت (Definitness)

4- تعین (Magnitude)

5- جلال (Magnificance)

ارسطو فن سنگ تراش، مصوری اور شاعری کو نقالی نہیں بلکہ فن کی بہتر صورت سمجھتا ہے۔ یہ تخلیقی استعداد ذہانت کی وجوہات کا نام ہے۔ یہاں ارسطو ایک بڑا عجیب وغریب سوال کرتا ہے کہ کیا خوشی اور مسرت کا نام بھی حسن ہے؟ وہ کہتا ہے کہ نہیں۔ جب غم اور Horrer آتا ہے تو اس کا اثر اتنا پڑتا ہے کہ جب وہ روتے ہیں تو اس سے رقت پیدا ہوتی ہے۔ دراصل حسن کا کام ہے ایک Cathoretic Process انجام دینا۔ کیتھارسس کا مطلب ہے انقباض دل کا انشراح یعنی جب جذبے کشیدہ ہو جائیں، دل تنگ ہو جائے اور وہ اس وقت کسی فن پارے کو دیکھے، شعر سنے یا کوئی دھن سنے تو دل کو قرار اور سکون آجائے۔ اسے Outlet of emotions کہتے ہیں۔ یہی کیتھارسس ہے۔ ارسطو کے نزدیک یہی وظیفہ فن ہے۔ اس لفظ کا کوئی متبادل نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ہی یونانیوں میں سے ایک بڑا فلسفی Epicurius پیدا ہوا جو اطمینان اور مسرت کا باعث عقل کو سمجھتا ہے اور حسن کو ملال سے تعبیر کرتا ہے۔ یہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ لذت سے مراد عقلی لذت ہے جو اس کے نزدیک اعلیٰ ترین لذت ہے۔

اس کے بعد قریباً قریباً پکا مسلمان فلسفی پیدا ہوا جو فلسفہ الوہیت کا قائل تھا۔ اسے Zino, the Stoic of Elia کہتے ہیں۔ اس نے ترک دنیا اور ترک لذات کو حسن کہا۔ یہ

لذت پرستی کا مخالف تھا۔ وہ کہتا ہے حسن ریاضت وپاکیزگی ہے' لذت پرستی نہیں۔ کائنات مکمل ہے مگر انسان نامکمل ہے۔ فطرت پر غور کرنا ہی حسن ہے۔ اس کو رواقیہ بھی کہتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ کسی چیز سے متاثر ہو جانا علم و عقل کی کمی کا باعث ہے۔ اصلاً اگر غور کیا جائے تو دیکھنے میں تو یہ بڑے زاہد لوگ ہیں' پاک لوگ ہیں مگر دراصل ان کی زاہدانہ صفات بھی خود غرضانہ ہیں۔ بقول حافظ شیراز ؎

زاہد نہ داشت تاب جمال پری رخاں
کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت

اگر رواقیہ پر تنقید کسی شعر سے ممکن ہے تو وہ حافظ کا یہ شعر ہے یعنی حسن سے متاثر نہ ہونا زہد نہیں کہ یہ فطرت انسانی ہے کہ خوبصورتی اسے بھاتی ہے۔ وہ خوبصورتی کا قائل ہے۔ اسے حسن اچھا لگتا ہے۔ جب بھی کوئی انسان خلاف فطرت کام کرے گا تو اسے معتدل و معقول انسان نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اب رومنز کی باری ہے۔ تاریخ روما میں سسرو (Cicero) سے بڑھ کر کوئی استاد نہیں ہے۔ اس کے بغیر تاریخ روما مکمل نہیں ہوتی۔ سسرو حسن و خیر کی یکجائی کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حسن و خیر ایک ہی چیز ہے۔ تناسب میں جیسا رنگ ملا دیا جائے تو وہ حسن بن جاتا ہے۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے رنگ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس نے پہلی بار یہ نئی بات کی ہے۔ کلام میں وزن' قافیہ اور ردیف کر دیا جائے تو حسن بن جاتا ہے۔ سسرو حسن کے متحرک نظریہ کا قائل ہے۔ وہ اسے اضافی اور تغیر پذیر سمجھتا ہے۔ اس کے بقول:

"دنیا میں ایسی کوئی خوبصورت شے نہیں جس سے زیادہ خوبصورت شے دنیا میں موجود ہو۔"

دیمو قراطس کہتا ہے:

"ایک مہذب اور غیر فانی قوت ہی کائنات میں حسن ہے۔"

یہ ایک دیوتائی نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ یہ لوگ محض الوہیت خداوند کے قائل نہ تھے۔ جب آج ہم اجرام فلکی کی دنیا دیکھتے ہیں تو یہ رومن زمانے کے ہی وضع کردہ ہیں۔ آج ہم بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ یہ میرا اسٹار ہے مگر Olympic gods کے بعد یہ روم کی Mythology ہے اور ان کے دیوتاؤں کے نام ہیں جنہیں ہم اپنے سٹار قرار دے رہے ہیں اور بڑے تفاخر سے ان کے نام لیتے ہیں۔

اس کے بعد ایک بڑا شاعر ورجل (Virgil) پیدا ہوا۔ وہ کہتا ہے کہ حسن لوگوں کو غیر محسوس سے محسوس کی طرف لاتا ہے اور منازل فکر میں اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے بعد پلوٹارچ (Plutorch) آتا ہے جو روما کا بڑا مورخ ہے۔ اس نے فلسفیانہ موضوعات پر بھی رائے دی ہے۔ یہاں ہم مارکس اوری لیس (Marcus Aurilius) اور پروٹارچ کا اکٹھا نقطہ نظر بیان کرتے ہیں۔

پروٹارچ کہتا ہے کہ حسن بدل نہیں سکتا۔ بدصورت ہمیشہ بدصورت رہے گا اور حسین ہمیشہ حسین مگر جو فنکار بدصورتی کو پیش کرتا ہے' اس کی Presentation کی تعریف ہو سکتی ہے۔ گو یہ خوبصورتی نہیں بن سکتی۔ صرف فن کو خوبصورت کہہ سکتے ہیں۔ یہاں سے موضوع تھوڑا Tilt کر جاتا ہے کہ ٹیکنالوجی بھی خوبصورت ہو سکتی ہے۔ یہ اس کی ادائیگی پر منحصر ہے۔ مارکس اوری لیس جو روم کا بادشاہ تھا اور صاحب فکر انسان تھا' اس کا خیال ہے کہ حسن اثرات کی صفتہ مطلق ہے مگر جوں جوں ان دانشوروں کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے' اس کے نظریہ حسن میں بھی تبدیلی آتی جاتی ہے۔ مارکس اوری لیس حسن کے بارے میں کہتا ہے کہ حسن کے بارے میں کچھ کہا جائے یا نہ' وہ حسن ہی رہتا ہے۔ گو ظاہراً یہ عوامی سی رائے لگتی ہے مگر یہ اشیاء کے وجود میں حسن مطلق کے وجود کو ثابت کرتی ہے۔ فروسٹانس کہتا ہے "دراصل مصور وہ ہے جو حسن کو پہلے ذہنی اور جذباتی سطح پر محسوس کرتا ہے اور پھر اس کو Present کرتا ہے۔" یہاں ایک اور بڑے مصنف لانجائنس (Longinus) نے ایک انحراف کیا۔ اس نے حسن زوال کی بجائے عظمتوں اور جبروت کی رفعتوں کو قرار دیا۔ اس نے کہا دراصل بات یہ ہے کہ جب ہم کائنات میں پھیلے ہوئے بہت بڑے بڑے نظارے دیکھتے ہیں تو ہم اس عظیم حسن کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ہم پر حسن دراصل کبریائی کے جلال کی طرح وارد ہوتا ہے۔

اب ہم مصر کی طرف آتے ہیں۔ یہاں ہم مصر کی اس شخصیت کا تذکرہ کریں گے جس کا نام تو اتنا معروف نہیں مگر اس نے عالم اسلام کے افکار پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے اور آج تک مسلسل ڈال رہا ہے۔ نقشبندیہ کے دوائر اس سے لیے گئے ہیں۔ اسلام کے تمام بڑے بڑے صوفی فلاسفہ اس سے متاثر تھے۔ اس کا نام افلاطینوس (Platinous) ہے۔ یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے اللہ کا باضابطہ شعور دیا۔ یہ فلسفہ اشراق کا بانی ہے اور اشراقیہ کا بھی۔ اس کے نزدیک اللہ ہی حسن و نور ہے۔ انسانی مقصود بھی اللہ ہی ہے۔ اسی سے کیف و سرور اور وجد کی کیفیتیں

حاصل ہوتی ہیں۔ وہ عقل کی بجائے بصیرت اور وجدان کا قائل ہے۔ وہ صوفیانہ کشف کے ذریعے حسن مطلق کی آگہی کو حسن کہتا ہے۔ اس کا نظریہ حسن زندگی ہے 'نور ہے۔ وہ کہتا ہے حسن مردہ کا نہیں ہو سکتا۔ اگر حسین ترین شے بھی زندگی سے محروم ہو جائے تو وہ زندہ کے حسن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ زندگی کو وصف حسن سمجھتا ہے۔ اس کا خیال ہے حسن اس شے میں ہوتا ہے جو زندہ ہے۔ دو انسان اگر ایسے حال میں ہوں کہ ایک بدصورت اور ایک حسین مگر حسین مر چکا ہو اور بدصورت زندہ تو حسن کا امین زندہ ہو گا نہ کہ مردہ حسین۔ عشاق رنگ و نور سے نہیں بلکہ روح سے محبت کرتے ہیں۔ روح ذہانت سے حاصل ہوتی ہے اور اجسام حسن کا رنگ ہیں جو حسن ہے' وہ فطرت کے مطابق ہے اور بدصورت وہ ہے جو حسن سے دور ہے۔

اب ہم سینٹ آگسٹائن کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ بڑی جمالیاتی بدذوقیوں سے گزر کر' بڑی اخلاقی برائیوں سے گزر کر' انحطاط سے گزر کر بالاخر وہ فلاح کی طرف پلٹا اور باوجود اس کے کہ عیسائی تثلیث کے قائل ہیں۔ وہ اپنے فلسفہ خیال میں شدت سے تثلیث کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ خدائے واحد کا پرستار ہے اور اس نے حسن کے بارے میں ایک انوکھا نظریہ دیا۔

"کائنات کا حسن توازن اور ہم آہنگی سے ہے۔ جو اس کے خلاف ہے' وہ بے توازن ہے۔"

یعنی جو چیز آپ کو حسین لگتی ہے' وہ Harmony ہے اور جو چیز Disharmonous ہے' اس میں بھی حسن ہے۔ ادھر بھی ایک اصول کارفرما ہے۔ گو ان کے قوانین الگ الگ ہیں' اسے ہم نے مختلف عنوانات دے دیئے ہیں یعنی عدم تناسب میں بھی تناسب کا وجود ہے اور یہی حسن کا باعث ہے۔ آگسٹائن کے ہاں ہر حسینکا حسن اس کے اجزاء کا تناسب اور اعتدال سے ہے۔

اب ہم جدید فلسفہ کی طرف آتے ہیں۔

سپنوزا ایک Depressive فلسفی ہے۔ اس کے نزدیک اس کائنات میں نہ حسن ہے نہ بدصورتی۔ نہ یہاں کوئی شے اچھی ہے اور نہ ہی بری۔ وہ سرے سے اس تصور ہی کا منکر ہے۔ اس کے نزدیک حسن ایک بے معنی اصطلاح ہے اور عقل کے الجھاؤ کا باعث ہے۔ تمام اشیاء انسان کے لیے ہی معرض وجود میں آتی ہیں تو پھر جس چیز کا اثر انہیں اچھا لگے' اسے حسین و اعلیٰ خیال کرتے ہیں یعنی وہ انسان کے نقطہ نظر سے کسی Local Effect کو بھی

حسن کہتا ہے کہ کوئی چیز اچھی لگے تو اچھی ورنہ بری ہے مگر یہ انفرادی تجربہ ہے۔اس طرح وہ کائنات میں Non-Committed Attitude اختیار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے جب عام انسان بلند ہوتا ہے تو وہ کسی اچھی چیز سے اپنی زندگی کا ماخذ ڈھونڈتا ہے اور وہ عمومیت سے ہٹ کر خصوصیت کی طرف بڑھتا ہے۔

لارڈ ہوبس (Lord Hobbes) اس قبیل کا فلسفی ہے جنہیں رومانی مفکرین کے بعد انگلستان کے خدائے عقل سمجھا گیا ہے۔ انہوں نے مادیت کے وجود کی مخالفت کی۔ عام پھولدار جھاڑیوں سے معمور میدان بھی اتنا ہی خوبصورت ہو سکتا ہے جتنے کہ انگور یا زیتون کے درختوں کا منظر لیکن ان کی قدر سے ناواقف شخص کو ایسا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ حسن ایک ایسی Value ہے جو اس کو نظر آتا ہے' جو اسے جانتا ہے بغیر علم کے Value کا ادراک نہیں ہو سکتا۔

باؤن گارٹن کے نزدیک احساس اور جذبے کی تکمیل کا نام حسن ہے۔ یہ کائنات جو کئی تضادات کی حامل ہے' یہ اپنے ان تضادات اور Disharmony میں بھی ایک مکمل Hormony رکھتی ہے جسے ہم وحدت کا نام دیتے ہیں۔ یہ وحدت کمال ہے اور کمال مظہر حسن ہے' لہٰذا جس میں کمال نہیں ہے یا جو حریف کمال ہے' وہ حسن نہیں ہے۔

ہوذاس کہتا ہے کہ بہت سارے ٹیڑھے خطوط ہوں تو وہ آپ کو اچھے نہیں لگیں گے مگر ان میں موجود ایک سیدھا خط آپ کو اچھا لگے گا۔ یہ حسن ہے' اس لیے پر تکلف ڈیزائن حسن آفرینی کے لیے ضروری ہے۔

ھنیال طریق فن کو حسن کہتا ہے کہ جو طریقہ فطرت کا اسلوب ہے اور جس طرح وہ حسن کا اظہار کرتی ہے' وہ حسن ہے۔

لیسنگ کہتا ہے حسن صرف خارجی اور محدود مادی پہلو کا نام ہے اور مادی پہلو جو خارجی اور مرصع ہے' وہ حق ہے یعنی وہ خدوخال کو حسن کہتا ہے۔ وہ ناک نقشے اور Decoration کو حسن کہتا ہے۔

اب ہم ان تین بڑے دعووں کی طرف آتے ہیں جن کے بغیر کوئی بات مکمل نہیں ہوتی۔ میری مراد کانٹ' نٹیشے اور ہیگل سے ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اتنے بڑے اور فلسفہ و حکمت میں اتنے بے مثال ہیں کہ ان کے بغیر فلسفہ و عقل کی کوئی بات مکمل نہیں ہوتی۔

جمالیات کے باب میں کانٹ کا موقف ہے کہ جب ہم حسن کو Appreciate کرتے

ہیں تو ہم عقل سے لا تعلق ہو جاتے ہیں کیونکہ حسن کو سائنسی اندازوں کے معیار پر پرکھا نہیں جاسکتا۔ حسن کو پرکھنے کے لیے لا تعلق ہونا ضروری ہے کیونکہ اس میں کچھ ایسی چیزیں موجود ہیں جن کی توجیہہ و تعلیل نہیں ہو سکتی۔ حسن ایک ایسی مسرت بخش شے ہے جو آفاقی اور ضروری ہے مگر یہ دونوں داخلی اور موضوعی ہیں۔ خارجی حقائق میں ان کی کوئی دلیل نہیں دی جاسکتی۔ ایک حد تک اس میں مقصدیت ہے۔ اگر یہ بغیر مقصد ہی ہو تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ حسن کا تعلق افادیت اور کمال سے نہیں کہ حسن ضرور فائدہ مند ہو۔ حسن کو جاننے کا شعور نہ تو مجرد عقل سے ہے' نہ صرف احساس سے ہے' نہ صرف اخلاق سے۔ ان میں سے کوئی بھی ادراک حسن کے حوالے سے آخری حوالہ نہیں ہے۔

جمالیاتی شعور عقل و احساس کا مقام ہے۔ وہ ایک آزاد حسن (Free Beauty) کا تصور پیش کرتا ہے۔ وہ حسن پاکیزہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ کسی چیز کے توسل سے محسوس ہوتا ہے۔ اگر وسیلہ نہ ہو تو حسن محسوس بھی نہ ہو۔ چونکہ حسن داخلی اور موضوعی ہے اور اس کا ادراک (Judgment) بھی داخلی ہے۔ اس طرح جلال (Sublimity) کا ادراک بھی جذبہ عقل پر ہے۔ فن اس وقت حسین ہوتا ہے' جب وہ فطرت کے قوانین سے آزاد ہوتا ہے۔ فطرت حسین ہوتی ہے' جب وہ مقصدیت فن کی حامل ہو۔

شیلر کہتا ہے کہ حسن بلاشبہ خارجی اور معروضی (Objective) شے ہے۔ یہ اندر نہیں' باہر ہے۔ غور و فکر ایک ضروری شے ہے۔ یہ اندر نہیں باہر ہے۔ جس کے تحت ہمیں اس کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ہماری حالت بھی ہے اور ہمارا عمل و فعل بھی۔ جمالیات میں شیلر نے مشابہت کے نظریئے کا اضافہ کیا۔ مشابہت کا مطلب Presentation of the Likeness ہے۔ اس کو وہ فن کہتا ہے۔

نیٹشے جو بہت سارے مضامین میں اقبال کا استاد ہے' جن لوگوں نے اقبال پڑھا ہے' ان کو اس بات کا علم ہے کہ اقبال نے اپنا فلسفہ خودی نیٹشے سے اخذ کیا ہے۔ اگرچہ اس نے اسے اسلامی رنگ میں ڈھالا ہے اور اس کی Approach کو بدل دیا ہے۔ جب ہم جمالیات کے موضوع پر نیٹشے کا نکتہ نظر دیکھتے ہیں تو لگتا ہے' ہم اقبال کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

نیٹشے کہتا ہے کہ حسن اضافی اور اعتباری ہے۔ کائنات میں حسن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب Ultimate Ego سے مستعار لے کر انسان اپنی ایگو کے مظاہرات پیدا کرتا ہے۔ جب انائے کبیر سے متاثر ہو کر انسان جو انائے صغیر کا مالک ہے' مظاہرات پیدا کرتا ہے

خودی کا سرِ نہاں...... لاالہ الااللہ

یہ وہ بنیادی فلسفہ ہے جو اقبال نے نیٹشے سے لیا اور اسے اسلامائز کر لیا۔ نیٹشے کا کہنا ہے کہ جب انائے صغیر اپنا اظہار کرنا چاہتی ہے اور حسن میں کرنا چاہتی ہے تو انائے صغیر کا مالک انسان اپنی خودی اور اپنے اندر کے ذریعے اس کا اظہار کرتا ہے۔ یہ خارجی نہیں ہے' خالصتاً داخلی ہے۔ مختصراً عقل اور احساس کی وحدت کو جمالیاتی وحدت کہتے ہیں۔

ہیگل کہتا ہے کہ (Idea) خیال یا حقیقی تصور مطلق جب ہمارے حواس پر اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے تو اسے حسن کہتے ہیں کہ جب کوئی Idea خیال مطلق یا حسن مطلق ہمارے حواس پر وارد ہوتا ہے تو ہم اس کا احساس کرتے ہیں۔ حقیقت مطلقہ اصل ہے اور کائنات اس کی فرع ہے۔ اس لیے حسن کی حیثیت اعتباری اور اضافی ہوگی۔

شوپن ہاور قوت ارادی کو تخلیق کی قوت اور ہستی و موجودات کی اصل قرار دیتا ہے۔ ہر چیز کچھ نہ کچھ خصوصیت رکھتی ہے اور وہ کسی نہ کسی تعداد میں اس قوت ارادی کو ظاہر کرتی ہے اور یہ Will کے مظاہر ہی کسی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور حسن کہلاتے ہیں جبکہ بدصورتی اس Will کے ناقص مظاہر ہیں یعنی Will کی بہتر کارکردگی حسن اور ناقص کارکردگی بدصورتی کہلائے گی۔

کروچے ایک جدید فلسفی ہے۔ اس نے کہا کہ حسن اظہار مکمل ہے کیونکہ جو حقیقی اظہار نہیں ہوتا' وہ مکمل نہیں ہوتا۔ اگر اس نے حسن اور صداقت میں سے کسی چیز کا انتخاب کرنا ہو تو وہ صداقت کا نہیں حسن کا انتخاب کرے گا۔ کروچے کے نزدیک فن (Art) تصورات کو تشکیل کرنے کی قوت کا نام ہے۔ فنکار کا اصل سرمایہ تخیلات ہیں۔

وائٹ ہیڈ اقبال کے استاد اور بہت بڑے فلسفی ہیں۔ اس کا مطالعہ انسانی شعور کی بلاغت کا باعث ہے۔ اس کے نزدیک:

"موجودہ ترتیب حسن ہے۔"

جس ترتیب سے کسی چیز کو مرتب کیا جائے گا' وہ حسن کہلائے گی۔ حسن کی تعریف تب مکمل ہوتی ہے' جب ترتیب کے مقاصد کا تعین ہو جائے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ بذات خود حسن کی تعریف نہیں ہو سکتی مگر جس ترتیب سے آگے بڑھ کر حسن وجود میں آیا' جب اس کا تجزیہ ہوگا تو ہم حسن کی بہتر تعریف کر سکیں گے۔ حسن داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔ اس کی وحدت کو جو کمال ملتا ہے' اسے وہ حسن تصور کرتا ہے۔ وہ ہم آہنگی میں ہم آہنگی

(Harmony of the Harmony) کو کمال حسن قرار دیتا ہے۔

ہم نے قدیم تہذیبات سے لے کر آج تک تمام وہ معتبر فلاسفر اور دانشور جو اہم ہیں' انہیں Quote کر دیا ہے اور اس کا خلاصہ یوں ہے کہ بوطیقا میں ارسطو کہتا ہے:

"Beauty is not an end of the product. It is an enquiry. Work of art is a cultural product. It is not an everyday product."

پہلی بات جو اس نے کہی' وہ یہ ہے کہ:-
حسن بذات خود ایک مکمل شے نہیں ہے۔
فن کی تخلیق دراصل ثقافتی حاصل ہے اور اس کا انوکھا پن ہے اور
ہر روز کا حاصل نہیں ہے۔
یعنی حسن "انوکھا پن" ہے۔

کسی بھی فن پارے کا معیار اور نقاد کا معیار جدا ہے۔ جمالیات کی پرکھ کا انحصار ایک فرد پر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے دو افراد کی ضرورت ہو گی۔ ایک حسین اور ایک اس کی تعریف کرنے والا۔ یہ جمالیات کا بنیادی نظریہ ہے کہ اگر حسین از خود اپنے اندر ہی حسن کا حامل رہے تو اس کی Appreciation کبھی نہ ہو سکے گی۔ اس لیے اسے ایک نقاد کی ضرورت ہو گی۔ اس ضمن میں میرا یہ خیال ہے کہ:

نقاد کی رائے کبھی آزاد نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ کبھی بھی مقامی تعصبات سے آزاد نہیں ہوتا۔ مثلاً Jonathon Swift انگریزی ادب کا مشہور مزاح نگار ہے مگر انتہائی تلخ ہے کیونکہ تمام زندگی اس کا پیٹ خراب رہا۔ اس کو کبھی ڈھنگ کا کھانا نصیب نہ ہوا۔ اس نے اس کے مزاج میں اتنی تلخی پیدا کر دی کہ اس نے معاشرے پر سخت تنقید کی۔ جب ایک چھوٹی سی بیماری کے اثر کا یہ عالم ہے تو ایک نقاد معاشرے اور ماحول سے کس طرح آزاد ہو سکتا ہے۔ اس لیے فن پر تمام تنقید جزوی اور ایک Special Corner سے ہو گی اور نامکمل۔

اس طرح Catharesis کے خلاف یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر زمانہ حاضر کو دیکھیں تو سارے کا سارا کیتھارسس مار پیٹ کی فلموں اور ظلم و ستم کے واقعات میں نکل گیا۔ اس طرح فحش اور ننگے گیتوں میں نکل گیا مگر جب کیتھارسس کو عام لوگوں کے زاویہ سے دیکھیں گے تو یہ کبھی اعلیٰ وارفع نہیں ہوتا۔ اس طرح خیر بھی ہمیشہ ہر آدمی کے لیے باعث

خیر اور قابل پسند نہ ہو گی۔ اعلیٰ اقدار و اخلاق کو آرٹ میں پیش کرنے کے لیے کئی مراحل ہوں گے مثلاً۔

اظہار کرنا۔

معلومات میں پیش کرنا۔

ایک عمومی جائزہ لیناوغیرہ۔

تمام فنکاروں کو ایک ہی ماحول ملتا ہے مگر ان کی Presentation میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جمالیات میں ہم نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ تمام فنکار متنوع نہ ہوں' باوجود ہم زمانگی کے کہ ان کی تعلیم و شعور اور مقصد ایک نہیں ہوتے مگر ان کا انداز ثقافتی اور شخصی اہمیت کا حامل ہو گا۔ اس طرح کلچر اور پرسن مل کر ادب و فن میں انداز (Style) تخلیق کرتا ہے۔

اب ہم قرآن حکیم کی طرف آتے ہیں۔

امام راغب فرماتے ہیں:

''حسن وہ شے ہے جو مسرت بخش ہے۔'' عقل اس کی خواہش کرتی ہے اور یہ عقل کو مرغوب ہے۔ حسن کا الٹ سوء ہے' بدصورتی ہے اور سووہ بات ہے جو باعث غم ہے۔ جو نفسیاتی' ذہنی اور اخلاقی رنج کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

قال انه یقول انها بقرة صفراء فاقع لونها تسر النظرین (۶۹:۲)

ترجمہ:- موسیٰ نے کہا' وہ فرماتا ہے کہ وہ گہرے زرد رنگ کی گائے ہے۔ اس کا رنگ دیکھنے والوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔

یعنی اس کے رنگ میں تمہارے لیے مسرت ہے' خوشنمائی ہے۔ قرآن حکیم میں جمالیاتی تفاصیل کے باب میں رنگ تک کا تذکرہ فرمایا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

هو الله الخالق البارئ المصور له الاسماء الحسنى (۲۴:۵۹)

ترجمہ:- وہی اللہ تمام مخلوقات کا پیدا کرنے والا' بنانے والا اور صورت عطا کرنے والا ہے۔ اسی کے لیے اچھے اچھے نام ہیں۔

اب اس مصور عظیم کی' اس پروردگار عالم کی تصاویر کے کچھ رنگ دیکھتے ہیں کہ اس کا فلسفہ حسن کیا ہے؟ ایک مقام پر قرآن حکیم نے شام کا منظر (Land Scap) بیان کیا ہے کہ جب چرواہے شام کو اپنے جانور چرانے کے بعد گھر لے کر آتے ہیں تو اس وقت کے منظر کے حسن کا کیا عالم ہوتا ہے؟

ولکم فیھا جمال حین تریحون وحین تسرحون (۱۶:۶)

ترجمہ:-اور جب (تم چوپاؤں کو) شام کے وقت چرا کر لاتے ہو اور صبح چرانے لے جاتے ہو تو اس میں تمہاری عزت وشان ہے۔

یہاں ابلاغ کے کمال کا یہ عالم ہے کہ پورے منظر کو ان جامع الفاظ میں بیان کر دیا۔"ولکم فیھا جمال" کہ اس میں تمہارے لیے حسن ہے۔ یہ حسن اس نے پیدا کیا۔ اسے معلوم ہے کہ یہ حسن ہے مگر یہ حسن اس آدمی کو پیارا لگے گا جو اس کی Appreciation کا جذبہ رکھے گا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین جزا بما کانوا یعملون (۱۷:۳۲)

ترجمہ:-پس کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔ یہ ان کے نیک اعمال کا صلہ ہے۔

یعنی انعامات الٰہی اور جنت کو آنکھوں کی ٹھنڈک بنایا گیا ہے یعنی قرآن کے تصور جمالیات کے ذیل میں:

1-رنگ۔

2-اس کا متحرک ہونا' حسن نظارہ اور

3-آنکھوں کی ٹھنڈک ہونا۔

کو بیان کرتا ہے۔ اس تصور کو حدیث مبارکہ میں یوں بیان کیا گیا:

قرۃ عینی فی الصلوۃ (الحدیث)

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

حسن کی گزشتہ تمام تعریفات کے مقابل قرآن حسن کی یہ تعریف کرتا ہے:

الذی احسن کل شی خلقه وبدا خلق الانسان من طین (۳۲:۷)

ترجمہ:-وہی ہے جس نے جو شے بنائی' خوب بنائی اور انسان کی تخلیق کی ابتداء اس نے گارے سے کی۔

یعنی پروردگار نے ہر چیز کو حسن سے بنایا۔ ترتیب سے بنایا یعنی یہاں قبح کے تصور کو کلیتاً رد کر دیا گیا ہے یعنی

"There is no concept of ugliness with God."

اس نے ہر چیز کو اچھا اور خوبصورت بنایا ہے۔ان کی اچھائی یا برائی ہمارے انتخاب پر مرتب ہوتی ہے۔اب تخلیقات اسی انداز سے جمادات سے حیوانات تک بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس نے ارشاد فرمایا:

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم(۹۵:۴)

ترجمہ:-بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین تناسب (واعتدال) پر بنایا ہے۔

تمام چیزیں تو تناسب اور خوبصورتی سے بنائی گئیں مگر انسان کو خصوصی توجہ دی گئی ہے اور خداوند نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔گو ہر چیز میں حسن رکھا گیا ہے مگر انسان کی تخلیق میں اس سے کچھ سوا بھی ہے یعنی خدا عمومی فن پاروں سے خصوصی فن پارے کی طرف بڑھ رہا ہے۔اگرچہ کائنات میں اللہ کی خلاقی اس کے حسن کی دلیل ہے مگر پھر فرمایا:

ذلك متاع الحيوة الدنيا (۳:۱۴)

ترجمہ:-یہ (تمام ترنعمتیں) دنیوی زندگی کا سرمایہ ہے۔

اور

والله عنده حسن الماب (۳:۱۴)

ترجمہ:-اور (اہل حق کے لیے) اللہ کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے کہ اللہ کے پاس اس سے بھی بڑھ کر ہے جو کچھ یہاں ہے۔

فوقهم الله شر ذلك اليوم ولقهم نضرة و سرورا (۷۶:۱۱)

ترجمہ:-پھر اللہ (اہل حق کو) اس دن کے شر سے بچالے گا اور ان کو شگفتگی اور سرور عطا فرمائے گا۔

یعنی وہاں حسن ہے،شائستگی ہے کہ کوئی اونچی آواز سے وہاں بات بھی نہیں کرتا۔وہاں بات بھی یہ ہوگی

ونادوا اصحب الجنة ان سلم عليكم (۷:۴۶)

ترجمہ:-اور اہل جنت کو وہ پکار کر کہیں گے،اللہ کی تم پر رحمت و سلامتی ہو۔

وہاں کوئی آلائش اور میل نہیں ہے۔اسی طرح جب صورتیں پیدا کیں تو تمام صورتوں کے بارے میں فرمایا:

وصوركم واحسن صوركم ورزقكم من الطيبت (۴۰:۶۴)

ترجمہ:-اور اللہ نے تمہاری صورتیں بنائیں تو کیا اچھی صورتیں بنائیں اور پاکیزہ

چیزوں سے تم کو رزق عطا کیا۔

الذی خلقك فسوك فعدلك. فی ای صورة ماشاء رکبك (۸۲:۷،۸)

ترجمہ:-جس نے مجھ کو پیدا کیا' پھر تمہارے اعضاء کو درست کیا' پھر ان میں تناسب رکھا اور جس صورت میں چاہا' تجھے ترتیب دیا۔

کہ اللہ نے تمام صورتیں اچھی بنائیں اور تناسب کے ساتھ بنائیں۔اس طرح ارشاد ہوا:

الله نور السموت والارض (۳۵:۲۴)

ترجمہ:-اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

زمین و آسمان کی ہر تصویر میں اس کا رنگ نور جھلکتا ہے۔اس کی چمک ہے۔اس کی روشنی ہے۔اس کا حسن ہے۔ لیس کمثله شی یعنی اس کی مثال بھی نہیں دی جاسکتی۔اس کے مظاہر کی Copy تو ہوسکتی ہے مگر اس جیسی ممکن نہیں مگر وہ خود ادراک حرف وبیاں میں نہیں آسکتا۔وہ Objective بھی ہے اور Creative بھی۔

فرمایا

والارض مددنها والقینا فیها رواسی وانبتنا فیها من کل شیء موزون (۱۵:۱۹)

ترجمہ:-اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس پر سخت وزن کے پہاڑ رکھ دیئے اور اس میں ہر طرح کی چیز موزوں مقدار میں اگائی۔

یعنی ہم نے ہر چیز تناسب اور حسن سے تخلیق کی۔

لایحل لك النساء من بعد ولاان تبدل بهن من ازواج ولوا عجبك حسنهن الاما ملکت یمینك (۳۳:۵۲)

ترجمہ:-(اے رسولؐ مذکورہ عورتوں کے علاوہ) اور عورتیں آپ کو جائز نہیں نہ یہ جائز ہے کہ آپ ان بیویوں کی جگہ دوسری بیویاں کرلیں خواہ ان کا حسن آپ کو کتنا ہی اچھا لگے۔

یعنی حسن تعجب خیزی کو بھی آواز دیتا ہے۔یہ عجز خیال وعقل ہے' بقول شاعر۔

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

گویا حسن کبھی کبھی حیرت زدہ بھی کردیتا ہے۔پھر فرمایا

فطرت اللہ التی فطر النّاس علیھا (۳۰:۳۰)

ترجمہ:۔یعنی صاحب حسن مطلق نے مخلوق کو اپنے حسن کا عکاس بنایا مگر اس کی اپنی شان یہ ہے کہ:

کل یوم ھو فی شان (۲۹:۵۵)

حسن عطاو بخشش بھی ہے اور ظہور ذات بھی۔ تحصیل حسن کی استعداد تو اس نے ہر ایک کے اندر رکھ دی ہے مگر تکمیل حسن تب ہو گی جب وہ رب ذوالجلال کو منزل قرار دے گا ورنہ جمالیات کی تمام Definationادھوری ہیں۔

جہاں تک بیان حسن کا تعلق ہے' رب ذوالجلال تو مچھر تک کی مثال لے آتا ہے۔ ممکن ہے کسی کو گمان گزرے کہ کیا مچھر بھی اس قابل ہے کہ اس کی تخلیق پر رب ذوالجلال فخر کرے تو ارشاد ہوتا ہے کہ اسے نہیں بلکہ اس کی ٹیکنالوجی کو دیکھو۔ تم کوشش بھی کر لو تو اس کی مثل نہ لا سکو گے۔ اگر تم اس حقیر مخلوق میں موجود پروٹوپلازم کی تفصیل میں چلے جاؤ تو اس کی تفصیلات کے تصور سے ہی تم پاگل ہو جاؤ گے۔ اس تخلیق کے حسن کو دوسرے مقام پر یوں بیان کیا:

وزینا السماء الدنیا بمصا بیح و حفظا ذلك تقدیر العزیز العلیم (۱۲:۴۱)

ترجمہ:۔اور ہم نے سب سے قریب والے آسمان کو چراغوں سے زینت بخشی اور اس کو محفوظ کر دیا۔ یہ انتظام ہے زبردست اور علم والے پروردگار کا۔

اگر ہم ان ستاروں اور سورج کو قریب سے دیکھ لیں تو خاکستر ہو کر رہ جائیں مگر یہ ساری اذیتیں الوہی تناسب کی وجہ سے فرحت کا باعث بن گئے اور زینت کا باعث بن گئے ہیں۔

ان جعلنا ما علی الارض زینة لھا لنبلوھم ایھم احسن عملا (۱۸:۷)

ترجمہ:۔اور جو کچھ زمین پر ہے' ہم نے ان کو ان کے لیے باعث رونق بنایا ہے تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ کون (دنیا سے محبت کرتا ہے اور کون مالک دنیا سے محبت کر کے) نیک عمل کرتا ہے۔

یعنی زمین کے سجاؤ اور بناؤ سنگھار کا بھی انتظام کر دیا کہ بنیادی طور پر انسان کو وہی Task دیا گیا جو الوہی ہے کہ یہ فطرت پر تخلیق کیا گیا ہے۔

ماتریٰ فی خلق الرحمٰن من تفوت' فارجع البصر ھل تریٰ من فطور (۳:۶۷)

ترجمہ:-اے دیکھنے والے تو رحمٰن کی کاریگری میں کوئی فرق نہیں دیکھے گا۔ ذرا دوبارہ آنکھ اٹھا کر دیکھ 'کیا تجھے کہیں کوئی خلل (رخنہ) نظر آتا ہے۔

ہمارے سارے مکانوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں مگر یہ ایک آفاقی چھت ہے جو بغیر ستونوں کے کھڑی ہے۔ وہ شجر و حجر اور پہاڑ اور سمندروں پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کیونکہ آج تک کسی نے بھی حسن کی تعریف میں اس کی ٹیکنالوجی کے حسن کو شامل نہیں کیا جبکہ حسن تکمیل میں نہیں بلکہ اس کے Process میں بھی ہے۔ گویا

حسن متوازن اور معقول ہے۔
حسن باعث تسکین جسم و روح ہے۔
حسن آگہی اور عقل و نور ہے۔
حسن ذاتی اور خارجی بھی ہے۔
حسن ابتداء اور انجام کے درمیان متغیر و متبدل ہے۔
حسن میں تناقص باعث حیرت و عبرت ہے۔
حسن ناآگاہی بھی ہے اور آگاہی بھی۔
حسن اضافی ہے 'زمانی ہے 'واقعاتی ہے اور متحرک ہے۔
حسن تقسیم درجات بھی رکھتا ہے مگر انجام میں لازوال اور لاانتہاء ہے۔
حسن مادی بھی ہے اور غیر مادی بھی۔
حسن تخیلاتی 'وجدانی اور رومانی بھی ہے۔
حسن کمال بدن و روح ہے۔ کمال فکر و جذبات بھی ہے۔
حسن زوال پذیر بھی ہے اور لازوال بھی۔
حسن ایک قدر ہے جو اشیاء کو مادی وجود اور نوری تصور میں عطا کی گئی ہے۔
حسن کا حقیقی نقاد اور تعریف کرنے والا خود خدا ہے۔ وہ ایک ایسا مصور ہے جو سب سے اعلیٰ اور منفرد ہے۔

ہم اکثر ایک جملہ سنتے ہیں کہ مصور نے اس میں جان ڈال دی ہے یا ہو بہو اصل کو بیان کر دیا ہے۔ یہی وہ صفت الٰہی ہے جس سے ہمیں وجود ملا۔ ہم اللہ کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں جنہیں مصور نے زندگی دے دی ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو تخلیق کے درجے سے بھلا دیا ہے۔ حالانکہ یہی تصور ہمارے لیے اس کے حضور حیرت و انکسار کا باعث تھا۔ خالق حقیقی انسان

کے علاوہ اپنی کسی بھی مخلوق پر ناز کر سکتا تھا۔ وہ انسان کو معیار حسن اور تصور حسن سے محروم کر سکتا تھا۔

وما تشاء ون الا ان یشاء اللہ ان اللہ کان علیما حکیما (۷۶:۳۰)

ترجمہ:- اور لوگو تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے۔ بجز اس کے کہ جو خدا ہی کو منظور ہو۔ بے شک اللہ جاننے والا اور بڑا حکمت والا ہے۔

مگر اس نے انسان پر اپنا یہ انعام فرمایا۔ حسن کی مکمل آگہی ذہن انسانی سے بالا ہے کیونکہ وہ اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے قابل نہیں ہے۔ انسان کی تمام تر تعریف حسن تقلیل علم و مواد (Defeciency of Data) کی پیداوار ہیں، مختصر ہیں، محدود ہیں، اضافی اور غیر مکمل ہیں۔ اللہ انسان کو جمادات، نباتات اور عالم حیوانات کے تصور جمال سے گزارتے ہوئے اپنے نظریہ جمال تک پہنچاتا ہے۔ اللہ کا نظریہ جمال

محمد رسول اللہ ﷺ

ہے۔ اللہ جمیل ہے اور جمال سے محبت رکھتا ہے۔ جس جمال سے وہ محبت رکھتا ہے، اس کی تھوڑی سی تعریف یہ ہے کہ:-

وہ احمد ہے۔
وہ محمد ہے، صادق ہے، امین ہے، رؤف ہے، رحیم ہے۔
جوامع الکلم ہے۔ شاہد و نبی ہے۔
حسن ہے، حسین ہے، احسن التقویم ہے۔
کمال فکر و عمل ہے، کمال اخلاق و کرم ہے۔
وہ بے مثال اور بے عیب ہے۔

شکل و شباہت میں، ادا و انداز میں، خد و خال میں، رنگ و بو میں، تکلم و تبسم میں، تفکر و تدبر میں، تکرم و ترحم میں، اشارہ و کنایہ میں علم بے پایاں میں، ابلاغ میں، ترفع میں، داخلی و خارجی زندگی میں، دوستی و رشتے میں، بچپن و بلوغت میں، صلح و جنگ میں، افتخار و اعجاز میں، حیات و ممات میں، تحصیل و ترویج علم میں، وہ پیکر حسن و جمال کل بھی بے مثال تھا، آج بھی ہے اور ابد تک رہے گا۔ وہ اللہ کا بندہ ہے، شاہد ہے، محبوب ہے، اللہ کا محمد ہے، اللہ کا احمد ہے۔

یہ تصویر جمال کیسی ہے؟ اس کا بیان اس کی زبان سے سنیں جس نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ ایک نادان اور سادہ مزاج بڑھیا جس سے اللہ کے رسولؐ کے دشمنوں نے پوچھا کہ کیا یہاں سے رسول اللہؐ گزرے تو ام معبد نے کہا:

"ہاں وہ جو پاکیزہ روح' کشادہ رو' پسندیدہ خو' نہ تو ند نکلی ہوئی' زیبا صاحب جمال' آنکھیں سیاہ و فراخ' بال لمبے و گھنے' آواز میں بھاری پن' بلند گردن' سرگیں چشم' باریک و پیوستہ ابرو' سیاہ گھنگریالے بال' خاموش و وقار کے ساتھ چال گویا دلبستگی لیے ہوئے۔ دور سے دلفریب قریب سے شیریں و کمال حسن' شیریں کلام' کلام کمی و بیشی سے معرا' تمام گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی' میانہ قد کہ کوتاہی سے حقیر نہیں نظر آتے۔ نہ اتنے طویل کہ آنکھ اس سے نفرت کرے۔ والا قدر' رفیق ایسے کہ اس کے دائیں بائیں رہتے ہیں۔ جب وہ کچھ کہتا ہے تو چپ چاپ سنتے ہیں۔ مخدوم اور مطاع' وہ جو حکم دیتا ہے' اس کے رفیق تعمیل کے لیے جھپٹتے ہیں۔

کیا اس سے بہتر کوئی تصویر ہو سکتی ہے۔

امام ابن حزم نے آپ کا حلیہ مبارک اس طرح نقل کیا ہے۔

"رسول اللہؐ نہ بہت لامبے تھے نہ پستہ قد۔ آپ کا قد مبارک میانہ تھا۔ رنگ کے اعتبار سے نہ بالکل سفید نہ گندم گوں بلکہ رنگ سفید کے ساتھ ساتھ سرخی لیے ہوئے تھا۔ چہرہ مبارک چودھویں رات کی طرح روشن تھا۔ چمکدار سر کے بال نہ بالکل سیدھے نہ پیچدار بلکہ ہلکی سی پیچیدگی کے ساتھ گھنگریالے تھے۔ اعضاء کے جوڑوں کی ہڈیاں موٹی اور پر گوشت' دندان مبارک خوبصورت اور چمکدار۔ دھن اعتدال کے ساتھ فراخ تنگ نہ تھا۔ ناک خوبصورت تھی۔ رفتار تیز تھی۔ چلتے تو معلوم ہوتا جیسے ڈھلوان سے اتر رہے ہیں۔ توجہ فرماتے تو پورے بدن کے ساتھ توجہ فرماتے یعنی صرف گردن پھیر کر متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ نگاہ نیچی رہتی تھی۔ پنڈلیاں پر گوشت اور ملائم تھیں۔ ایڑھیوں پر گوشت کم تھا۔ ریش مبارک گھنی اور بال سیاہ تھے۔ آپ کے پاؤں کے تلوے قدرے گہرے تھے۔ سر کے بال لامبے ہوتے تو کانوں کی لو یا شانے تک پہنچتے ورنہ نصف کانوں کی لو تک رہتے۔ سر یا داڑھی کے بال زیادہ سفید نہ تھے۔"

یہ تو آپ کے فزیکل جمال کا خاکہ ہے۔ آپ کے روحانی اور اخلاقی جمال کا یہ عالم تھا کہ عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ آپ مال دینے میں سب سے زیادہ سخی تھے۔ آپ ان میں

چلتی ہوا سے بھی زیادہ سخیؐ تھے۔ انسؓ کا بیان ہے کہ میں نے ۱۰ برس تک آپ کی خدمت کی۔ آپ نے کبھی مجھے اف نہیں کیا۔ ایک مرتبہ آپ نے مجھے کسی کام کے لیے فرمایا۔ میں بازار میں بچوں سے کھیلنے لگا۔ ناگاہ میں نے آپؐ کا ہاتھ اپنی گردن پر پایا۔ میں نے دیکھا تو آپؐ ناراض نہیں تھے، مسکرا رہے تھے۔ فرمایا حضورؐ سب لوگوں سے زیادہ اچھی عادات رکھتے تھے۔

رسول اللہ سے جس نے کوئی چیز مانگی، آپؐ نے نہیں، نہیں فرمایا۔

نہ رفت لا بزباں مبارکش ہرگز
مگر در اشھدان لا الہ الا اللہ

انسؓ نے حدیث بیان کی کہ ایک بدوی آپ کے پاس سے پلٹ کر گیا تو اس نے کہا، اے میری قوم محمدؐ اتنا کچھ دیتے ہیں کہ پھر احتیاج نہیں رہتی۔ صفوانؓ نے کہا حضورؐ نے مجھے دیا جو دیا، وہ آپ سب لوگوں میں زیادہ مجھے غیر محبوب تھے۔ آپ مجھے دیتے رہے، اتنا دیتے رہے کہ آپ میرے لیے سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہو گئے۔ غرضیکہ کسی کو آپ کے جمال کا کوئی پہلو نظر آیا تو کسی کو کوئی۔

جب آپ کے فرزند حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپ نے فرمایا۔ آنکھ روتی ہے، دل رنج کرتا ہے مگر میں زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ سوائے اس کے جو اللہ کو پسند ہو۔ جب ایک بدو نے آپ سے سوال کیا۔ یا رسول اللہؐ کیا آپ بچوں سے پیار کرتے ہیں اور ان کو چومتے ہیں؟ قسم خدا کی ہم تو ایسا نہیں کرتے۔ فرمایا کیا کروں؟ خدا نے تمہارے دلوں سے رحم نکال دیا ہے۔ حیاو شرم کا یہ عالم تھا کہ آپ میں پردے میں رہنے والی کنواری لڑکی سے زیادہ شرم و حیا تھی کہ جس چیز کو آپ برا سمجھتے، صحابہ کرامؓ آپ کے چہرے سے پہچان لیتے۔ یہ Expression کی انتہاء تھی۔ فرمایا تم میں سے بہتر وہ ہیں جن کے خلق اچھے ہیں۔

انداز بیان کی نزاکت و لطافت کا یہ عالم کہ جب ایک مرتبہ ایک صحابی بیگمات کو جو اونٹوں پر سوار تھیں، تیز رفتاری سے لے جا رہے تھے تو فرمایا ''آہستہ لے چلو ان شیشوں کو'' ہاتھوں میں نور و برکت کا یہ عالم کہ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں۔ مدینہ کے لوگ اپنے پانی کے برتن آپ کے پاس لے آتے اور آپ اپنا دست مبارک اس میں ڈبو دیتے اور سردیوں میں بھی یہ معمول ہوتا اور آپ کو سخت تکلیف بھی ہوتی۔

حجام آپ کا سر بنایا کرتے تو صحابہ قریب ہوتے کہ آپ کا کوئی بال زمین پر نہ گرے۔ آپ معتدل اور فطری تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب آپ کو دو کاموں کا اختیار دیا گیا

تو آپ نے آسان کو چنا۔ آپ نے کبھی اپنے لیے بدلہ نہیں لیا۔ کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا' نہ عورت کو نہ خادم کو۔

جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں' آپ ظہر کی نماز کے لیے نکلے۔ سامنے کچھ بچے آئے۔ آپ نے ہر بچے کے رخسار پر ہاتھ پھیرا' میرے رخسار پر بھی ہاتھ پھیرا۔ آپ کے ہاتھ میں وہ خوشبو اور ٹھنڈک تھی جیسے خوشبو ساز کے ڈبے سے ہاتھ نکلا ہو۔ انسؓ نے فرمایا۔ میں نے عنبر و مشک میں اور کسی خوشبو میں ایسا حسن نہیں دیکھا جو آپ کے جسم مبارک کی خوشبو میں تھا۔ میں نے دیباج و حریر میں ایسی نرمی نہیں دیکھی جیسی آپ کے جسم مبارک میں تھی۔ آپ کا رنگ مبارک سفید چمکتا ہوا تھا اور سینہ مبارک موتی جیسا تھا۔ ام سلیم سے پوچھا' جب وہ پسینہ جمع کر رہی تھیں تو وہ کہنے لگیں' وہ یہ خوشبو اس لیے جمع کر رہی ہیں۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ پیشانی پر پہلے بال لٹکایا کرتے تھے' پھر مانگ نکالنے لگے۔

حضرت براءؓ کہتے ہیں۔ آپ میانہ قد تھے۔ سینہ کشادہ تھا۔ بال کانوں کی لو تک تھے۔ آپ سرخ و زرد لکیروں والا جوڑا پہنتے تھے۔ میں نے آپ سے بڑھ کر کوئی حسین نہیں دیکھا۔ آپ کا چہرہ مبارک سب سے خوبصورت تھا۔ قتادہؓ فرماتے ہیں' حضورؐ کے بال میانہ تھے' گھنگھریالے تھے' نہ سیدھے یعنی اگر دنیا کی بہترین تصاویر اور نقش و نگار کا بھی تصور کریں تو اس کا آپؐ سے مقابلہ ناممکن ہے حتیٰ کہ جب اس اعلیٰ ترین تخلیق کی Description کرنی چاہی تو پروردگار عالم کو بھی مشکل پیش آئی اور جب اس نے اس تصویر کامل کا نام رکھنا چاہا تو دیکھا کہ کسی Positive لفظ سے بات نہیں بنتی اور اس کے لیے اس نے Negetive لفظ استعمال کیا۔ فرمایا حریص علیکم یعنی اتنا مبالغہ کہ پروردگار عالم نے ایک انتہائی بڑے Positive فن پارے کو ایک Negetive لفظ سے بیان کیا۔

حضورؐ نے بھی ایک بات فرمائی کہ اگر کسی شخص کے سامنے میرا نام لیا جائے اور وہ درود نہ پڑھے تو وہ بخیل ہے۔ بخیل صرف حرص و ہوس کا ہی نام نہیں بلکہ یہ وہ شخص ہے جس میں کسی اچھی چیز کی کوئی Appreciation موجود نہیں ہے۔

اور حضورؐ اس معراج حسن پر ہیں کہ اگر آپ کا نام لیا جائے اور انسان میں ذرا بھی Appreciation Sense موجود ہو گی تو وہ ضرور درود پڑھے گا اور یہ بات ہے کہ وہ کافر ہو' مشرک ہو' جب بھی انسانی اقدار اور ذاتی حسن و جمال کا تذکرہ ہو تو چاہے وہ کارلائل ہو' وہ اپنے پیغمبر کو نہیں محمد رسول اللہؐ کو ہی ہیرو قرار دے گا۔ چاہے وہ "The 100" کا مائیکل

ہارٹ ہو' اسے نقطہ معراج پر آپ ہی نظر آئیں گے۔ اس لیے کہ آپ کے اخلاق کریمانہ کا یہ عالم ہے کہ:۔

لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ماعنتم حریص علیکم بالمومنین روف رحیم ٥ (التوبه'۹:۱۲۸)

ترجمہ:۔ تحقیق تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئے۔ جنہیں تمہاری تکلیف گراں گزرتی ہے اور وہ تمہارے لیے خیر پر حریص ہیں اور اہل ایمان کے لیے سراپا رافت و رحمت ہیں۔

ہم تصویر کو اس وقت عظیم مانتے ہیں جب وہ زندگی کے قریب تر ہو اور الوہی کمال حسن کی انتہاء یہ ہے کہ وہ اپنی تصویروں میں حقیقتاً جان ڈال دیتا ہے۔ اگرچہ تمام بنی نوع انسان اس کی تصاویر ہی ہیں مگر جو سب سے اعلیٰ تصویر اللہ نے بنائی' وہ محمد رسول اللہ ہیں کہ اس تصویر میں اس نے تمام جمالیاتی Aspects کو جمع کر دیا۔

ظاہر میں' میں باطن میں' ترفع میں' کمال میں یہ پیکر جمال آج تک ہمارے لیے باعث فخر' باعث نجات اور باعث رحمت ہے اور باعث صلوٰۃ ودرود ہے۔

یا صاحب الجمال ویاسیّد البشر
من وجھك المنیر لقد نور القمر
لایمکن الثناء کما کان حقه
بعد از خدائے بزرگ توئی قصه مختصر
اللھم صل علے محمد وعلے ال محمدؐ

وماعلینا الاالبلاغ ٥

خطبہ ششم

اسلام اور عصر حاضر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطنا نصیراO(۱۸:۸۰)

تمام نظام ہائے حیات اور فلسفہ ہائے خیال کے مقابل اسلام اس قدر زبردست فلسفہ حیات کا حامل ہے کہ آج تک کوئی دوسرا نظریہ اسلام پر غالب نہیں آسکا۔ مگر آج ہم اسلام کو اس طرح دیکھ رہے ہیں گویا کوئی بہت قدیم سی روایت دور جدید میں آکر کھو سی گئی ہے۔ گویا اسلام ایک پژمردہ حقیقت ہے جس کا تذکرہ آج فائیو سٹار ہوٹلز کے کلچر میں نہیں کیا جاسکتا' مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ کوئی بھی دور جدید اسلام کو پژمردہ یا Out Date نہیں کر سکتا۔ عصر حاضر ہو یا پھر عصر قدیم یہ ہمارے نزدیک وقت کی بندشیں ہیں۔ ہم نے زمانے کو اس طرح تقسیم کر دیا ہے مگر جس نے اسلام اور قرآن دیا ہے اس کے نزدیک وقت کی ایسی کوئی تقسیم نہیں ہے۔ رب ذوالجلال نے اس دنیا کو تخلیق کرنے سے پہلے اس کے ماسٹر پلان میں جسے لوح محفوظ کہا جاتا ہے' اس کے رنگ و بو اور جملہ تفصیلات کو لکھ کر بند کر دیا تھا اور اس پر سے اپنا قلم اٹھا دیا۔ پھر زندگی کو حرف کن کا حکم دیا اور زندگی کی سکیم کو رواں دواں کر دیا۔ اس خدا کے لیے نہ عصر حاضر کوئی شے ہے نہ آنے والے زمانے کوئی الگ سے حقیقت۔ چاہے کئی اکیسویں صدیاں بیت جائیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اولم یرالذین کفروا ان السموات والارض کانتا رتقا ففتقنھما وجعلنا من الماء کل شی ء حی افلایومنون (۲۱:۳۰)

ترجمہ: کیا جو لوگ کافر ہیں انہوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ آسمان وزمین ملے

ہوئے تھے۔ پھر ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا۔ اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے تخلیق کیا۔ پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔

یعنی ساری کائنات ایک Whole Mass تھی اسے الگ الگ کیا۔ اس سے تمام عالم اور عالم انسانیت وجود میں آیا۔ اس پر اربوں سال لگ گئے۔ قرآن نے اس کے لیے یوم کا لفظ استعمال کیا' مگر یوم کی وضاحت کیا ہے؟ جو اربوں سال کے برابر ہے۔ اس کی وضاحت اسی طریق پر ہوگی' جیسے کسی نے حضرت امام زین العابدینؒ سے سورۃ حدید کی آیت ھوالاول والآخر الخ کی تفسیر پوچھی تو فرمایا:

نزلت للمتعقلین فی آخر الزمان

ترجمہ: یہ آخر زمانے کے اہل عقل وفکر کے لیے نازل ہوئی ہے۔

آج جب ہم دیکھتے ہیں کہ Sky Lab خزائن الارض کی اطلاع دے رہے ہیں' سیارے کا کیمرہ چیونٹی تک کی تصاویر دے رہا ہے تو ہم پر یہ واضح ہوتا ہے کہ امام کا قول کتنا صحیح ہے۔ آج ہم پروردگار عالم کی اس آیت کا مطلب زیادہ درست طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا گیا قرآن کی وضاحت آنے والے زمانوں میں کس طرح کی جائے گی تو فرمایا:

القرآن یفسرہ الزمان

ہر زمانہ قرآن کی وضاحت خود کرتا ہے۔

اگر آج ہمیں اسلام اور قرآن پیچھے نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مفسر اپنے زمانے کے علوم سے آگاہ نہیں ہے۔ یعنی قرآن Decadent نہیں ہوا بلکہ مفسر Decadent ہو گیا ہے۔ آج ہم ایک عام علم کی تحصیل کے لیے بیس پچیس سال لگا دیتے ہیں۔ اس میں اتھارٹی حاصل کرنے کے لیے پوسٹ گریجوایشن کرتے ہیں' سپیشلائزیشن کرتے ہیں' ڈاکٹریٹ کرتے ہیں' مگر کائنات کے سب سے بڑے علم کی جستجو کے لیے ہم ان لوگوں کی طرف جاتے ہیں جو میٹرک جتنی اہلیت بھی نہیں رکھتے۔ اسلام' قرآن اور اللہ کسی زمانے میں بھی سائنسی اثر سے پیچھے نہ تھا۔ اسی طرح آج بھی ہے۔ زمانے کے عمومی تصور ہی کو لیں' قرآن نے بہت پہلے نہ تصور دے دیا کہ زمانہ محدود ہے' لا محدود نہیں ہے۔

اللّٰہ الذی رفع السموات بغیر عمد ترونھا ثم استویٰ علے العرش وسخرالشمس والقمر کل یجری لاجل مسمی (۱۳:۲)

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے بلاستونوں کے آسمان کو بلند کر رکھا ہے۔ جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو' پھر عرش پر قائم ہوا اور سورج کو چاند کو اپنے اپنے کام پر لگا دیا۔ ہر ایک معین وقت تک چلتا رہے گا۔

یعنی یہ تمام کائنات جس میں تم موجود ہو' ہم نے اسے ایک محدود وقت کے لیے بنایا ہے۔ مگر یہ تمام وسعتیں جن کی پیائش کے لیے ہمارے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہے Quantum ہو یا Reletavit ہمیں اپنے ہر اندازے کو کسی دوسرے پیمانے کے لیے Shift کرنا پڑتا ہے' کیونکہ انسان اسے لاانتہا سمجھتا ہے مگر دراصل وہ محدود ہے۔ ایک طرف اس کی ابتداء ہے:

وجعلنا من الماء کل شی حی. (۲۰:۱۳)

ترجمہ: اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے پیدا کیا۔

دوسری طرف اس کی انتہا اور انجام ہے۔

اذاالشمس کورت O واذاالنجوم انکدرت O (۸۱:۱'۲)

ترجمہ: جب یہ روشن آفتاب لپیٹ دیا جائے گا اور سب تارے بے نور ہو جائیں گے۔ (ٹوٹ کر گر پڑیں گے)

کل من علیھا فان ...... (۲۶:۵۵)

ترجمہ: جو کچھ بھی زمین پر ہے سب فنا ہونے والا ہے۔

اللہ ہر چیز سے باخبر ہے جو اسرار ہائے کائنات کو آج کے انسان کے سامنے صدیوں پہلے رکھ چکا ہے۔ کیا وہ زمانہ آخر کے انسانوں کے ذہن سے آگاہ نہ ہوگا۔ در حقیقت تمام زمانے قرآن تک پہنچنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہر زمانے کی نئی اور جدید سائنسی دریافتیں اس قرآنی دعویٰ کی تصدیق و وضاحت کے لیے ہی ہیں' جنہیں قرآن پہلے بیان کر چکا ہے۔ مثلاً یہ ارشاد ربانی:

والسمآء بنینھابایئد وانالموسعون...... (۴۷:۱۵)

ترجمہ: اور ہم نے آسمان کو اپنے دست قدرت سے بنایا اور ہم ہی صاحب قدرت ہیں کہ کائنات کو وسیع سے وسیع تر کرتے جاتے ہیں۔

سولہویں صدی تک یہ آیت نا قابل فہم تھی۔ یہ متشابہات قرآن میں سے ہے جو پہلے قابل فہم نہ تھی' مگر آنے والے زمانوں میں قابل فہم ہوئی۔ تمام مفسرین نے اس کا مفہوم

زور بازو اور رزق لیا ہے۔ یہ درست نہ تھا یہ اس آیت کا Literal مفہوم تھا۔ اگرچہ اہل اسلام اس آیت کی معنویت کو واضح کرنے کے قابل نہ ہوئے تھے' اس طرح یہ علم و حکمت اغیار کو مل گئی۔ دور جدید کے مایہ ناز سائنس دان آئن سٹائن نے اپنے نظریہ اضافیت میں بھی انکشاف کیا کہ تمام کائنات پھیل رہی ہے۔ اس طرح اس کی ایک عملی کاوش نے قرآن کی تفسیر کر دی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس آیت کی وضاحت ہمیں موجود تفسیروں میں مل جائے گی؟ ہرگز نہیں' اس کے لیے ہمیں آئن سٹائن اور جدید سائنسی تحقیقات کی طرف آنا ہوگا۔

یہاں قصور اللہ کا یا قرآن کا نہیں ہے بلکہ ان مفسرین کا ہے جو قرآن کو ایک معقول و منقول کی کتاب سمجھ رہے ہیں۔ جنہوں نے ناظرہ حروف سے آگے بڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ حالانکہ قرآن کائنات کی سب سے بڑی علمی دستاویز ہے۔ اس قوم نے شاید کبھی کسی چیز کی اتنی بے توقیری اور بے حرمتی نہیں کی جتنی قرآن کی کر رکھی ہے' حالانکہ پروردگار عالم انہیں یہ سرزنش اور تنبیہ کر رہے ہیں کہ اگر تم غور و فکر کے حامل ہوتے تو ہمیں اپنے عزت و جلال کی قسم کہ تم کبھی بھی کافر نہ رہ سکتے تھے۔ اگر مسلمانوں کی آج کی صورت حال کو دیکھیں تو الوہی دعوے کی حقیقت کتنی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد!
زاغوں کے تصرف میں ہیں شاہینوں کے نشیمن

آج قرآن وضاحت کے لیے ان لوگوں کے سپرد ہو چکا ہے جنہوں نے گزشتہ صدیوں کے تفسیری لٹریچر پر ایک حرف کا Addition نہیں کیا۔ اگر تفسیر کے حوالے سے صحابہ کرامؓ کا رویہ دیکھیں تو وہ بھی جدید تر نظر آتا ہے۔

واعبدربك حتى ياتيك اليقين (۱۵:۹۹)

کی وضاحت کرتے ہوئے تمام صحابہ رسولؐ نے یقین کا ترجمہ موت کیا۔ اس لیے کہ یقین کا حصول کسی Transition کے لمحے میں ممکن نہیں ہے' کیونکہ ہر لمحہ تبدیل ہونے والا ہے۔ اس کی ہر حیثیت بدل جائے گی۔ یہ صرف موت کی دہلیز' لمحہ سکرات ہی ہے جو علمی یقین دے سکتا ہے۔ گویا یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ انسان اس وقت تک تم اپنی تعلیم و تربیت کو ترک نہ کرنا جب تک تم اپنی موت کو نہ پہنچو۔ اس کی عملی مثال ہمیں حضرت علیؓ کی زندگی میں ملتی ہے کہ جب ابن ملجم نے آپ کو زخمی کیا اور آپ شہید ہو رہے تھے تو

فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں منزل ہستی سے ایمان سلامت لے کر نکل رہا ہوں' چونکہ علیؓ کا مقام علمی اتنا بلند تھا کہ آپؐ نے فرمایا "میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ" جب آپ کا مقام علمی اتنا بلند تھا تو حرف "یقین" کی وضاحت بھی آپ سے بہتر کون جان سکتا تھا؟

اسلام ایک ذہنی رویے (Mental Approach) کی تشکیل کرنا چاہتا ہے جس کی بنیاد تحصیل علم پر ہے۔ ایمان ہی کی تعریف کو لیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا "ایمان "بیم ورجا" کے درمیان ہے یعنی جسے تقدیر الٰہی کا خوف نہ رہا' وہ بھی اللہ کی گرفت سے غافل ہو گیا اور جس پر اس خوف کا غلبہ بڑھ گیا وہ زندگی سے ہی ناامید ہو گیا۔ الغرض اسلام کا ذہنی رویہ تحصیل علم سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ جب مسلمانوں نے تحصیل علم ختم کی تو زوال پذیر ہونے لگے۔ ایک وقت تھا جب دنیا میں تین بڑی قوتیں تھیں اور وہ تینوں عالم اسلام کی تھیں جبکہ مغربی یورپ پر حماقتوں اور جہالتوں کا دور دورہ تھا اور اسلام کی عظمتوں کا عالم یہ تھا کہ ایک طرف سلطان سلیمان ذیشان المعظم یورپ کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا' اکبر اعظم ماوراالنہر اور ایشیا تک حکمران تھا اور تیسری قوت سلطان عباس اعظم صفدر کی تھی۔ اکبر اعظم کے سامنے جب برطانوی حکومت کی وزارت آئی اور ملکہ انگلستان کا تذکرہ کیا تو اس نے اپنے وزیر سے پوچھا:

ایں جزیرہ نما چرا است؟

مگر فتح کا بھی ایک نقصان ہوتا ہے اور سب سے بڑا نقصان جو ہمیں ہوا وہ یہ تصور تھا کہ فتح' اقتدار ہمارا داخلی استحقاق ہے۔ اس کے لیے کسی کاوش کی ضرورت نہیں۔ اس طرح ایک روز جمود کا آغاز ہوا۔ عالم اسلام میں نئے نئے فتنے اٹھنے لگے اور عالم اسلام پر ایسا زوال آیا کہ آج ہمیں سائنسی، علمی، تحقیقی اور فکری میدان میں کوئی بڑی مستند شخصیت ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتی مگر یہ دور زوال وزمانہ جمود زیادہ عرصے تک نہیں رہے گا' زمانہ اب پھر پلٹ رہا ہے۔

نکل کر صحرا سے جس نے سلطنت روما کو الٹ دیا تھا!
سنا ہے قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا!

مگر ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا کہ خداوند عالم نے جس چیز پر اقوام عالم کے عروج زوال کی خشت اول رکھی' وہ صرف اور صرف علم ہے۔ اقتدار علمیہ ہر اقتدار سے بالاتر ہے:

نرفع درجت من نشاء وفوق کل ذی علم علیم (۱۲:۷۶)

ترجمہ: ہم جس کے چاہتے ہیں درجے بلند کرتے ہیں۔ اور ہر صاحب علم سے اوپر (بڑھ کر) صاحب علم موجود ہے۔

عصر حاضر اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ عالم اسلام کو عصر حاضر کی ترقی دیکھ کر کسی Inferiorty Complex میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آج ہمیں مغرب کی اچھی زندگی کی چکا چوند نظر آتی ہے تو یہ ان کی Skill اور ٹیکنالوجی ہے جو کسی بھی وقت ادھر منتقل ہو سکتی ہے۔ یورپ کی علمی ترقی بھی پچھلے ڈیڑھ دو سو سال سے رکی ہوئی ہے۔ علمی سطح پر یورپ نے کوئی بڑا کمال نہیں دکھایا۔ اضافیت کا قانون آج سے سو سال قبل دریافت ہوا۔ مگر دوسرا قانون آج تک ثابت نہیں ہو سکا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ نے ٹیکنالوجی میں ترقی کی ہے علم میں ترقی نہیں کی ہے۔ اصل اصول اور بنیاد علم ہے۔ جب ہریش ہرٹز (Heireich Hurts) نے بجلی کی لہروں کی فریکونسی دریافت کی اور پہلا ریاضیاتی فارمولا دیا اور مارکونی نے اس پر پہلا Instrument بنا لیا۔ اس کے بعد سائنس نے بجلی کے معاملات میں جتنی ترقی کی، وہ ٹیکنالوجی کی ترقی ہے، علمی ترقی نہیں ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ جب ہم یورپ کی ترقی کا تذکرہ سنتے ہیں تو اس کے بارے میں ایک غلط تاثر قائم کر لیتے ہیں۔ ہم ان کی ٹیکنالوجی کی ترقی کو علم ترقی قرار دیتے ہیں۔

اہل مغرب کا خیال ہے کہ مسلمان ہمیں 150 سال تک نہیں پہنچ سکتے، مگر ڈاکٹر قدیر نے ان کے اس دعوے کو عملاً رد کر دیا، کیونکہ یہ علمی نہیں بلکہ Technological Skill تھی۔ اور وہ علمی طور پر بھی قرآن ہمیشہ اپنے زمانے سے آگے رہا۔ چاہے یہ Ptolemy کا زمانہ ہو، گلیلیو کی دریافتیں ہوں یا آج کے دور میں Hopkin کے، تصورات ہر زمانے میں قرآن جدید تر ہے مگر شرطاً اسے سمجھنے کی ہے۔

Ptolemy نے کہا کہ زمین ساکت ہے اور باقی ساری کائنات اس کے گرد محو گردش ہے۔ ۱۵۴۲ء میں کاپرنیکس اور گلیلیو وغیرہ نے کہا کہ سورج ساکت ہے مگر قرآن پہلے بیان کر چکا ہے۔

اللہ الذی رفع السموات بغیر عمد ترونها ثم استوٰی علی العرش وسخر الشمس والقمر کل یجری لاجل مسمی (۱۳:۲)

ترجمہ: اللہ ہے وہ جس نے بلا ستونوں کے آسمانوں کو بلند کر رکھا ہے۔ جیسا کہ تم دیکھ

رہے ہو۔ پھر عرش پھر قائم ہوا اور سورج و چاند کو اپنے اپنے کام پر لگا دیا۔ ہر ایک معین وقت تک چلتا رہے گا۔

آئن سٹائن نے ۱۹۰۵ء میں کہا کہ کائنات چل رہی ہے، مگر قرآن اس سے پہلے بیان کرتا ہے کہ کائنات وسیع پذیر ہے:

والسمآء بنینھابائید وانا لموسعون (۵۱:۴۷)

ترجمہ: اور ہم نے آسمانوں کو اپنے دست قدرت سے بنایا اور ہم ہی اسے وسیع کر رہے ہیں۔

سائنس آج Big Bang کی بات کرتی ہے۔ قرآن اسے پہلے بیان کر رہا ہے۔

اولم یرالذین کفروان السموات والارض کانتا رتقا ففتقنھما وجعلنا من الماء کل شیء حی افلا یومنون (۲۱:۳۰)

ترجمہ: کیا جو لوگ کافر ہیں۔ انہوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ آسمان اور زمین ملے جلے تھے پھر ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے تخلیق کیا پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔

یہی نہیں بلکہ قرآن سات کائناتوں کا نقشہ دے رہا ہے۔ آسمان دنیا کو چراغوں سے سجانے کا تذکرہ کر کے قرآن بتا رہا ہے کہ یہ سب سامنے کی گلیکسی وغیرہ پہلی دنیا کی ہیں۔ تم نے ابھی تک بگ بینگ دریافت کیا ہے۔ ہماری سات کائناتیں ہیں۔ ہر کائنات میں ایک زمین ہے۔

اللہ الذی خلق سبع السموات و من الارض مثلھن (۶۵:۱۲)

ترجمہ: اللہ وہی ہے جس نے سات آسمان اور انہیں کی طرح زمین بھی (اپنی قدرت و حکمت سے) پیدا کیں۔

ہر کائنات میں اس کی اپنی Life Belt ہے مگر ہم نے ابھی تک ایک سے زیادہ زمین دریافت نہیں کی کیونکہ ہم ابھی ایک آسمان سے بھی نہیں گزرے۔ کیا ہر زمین پر زندگی ہے:

یتنزل الامر بینھن لتعلموا ان اللہ علیٰ کل شیء قدیر (۶۵:۱۲)

ترجمہ: ان میں اللہ کا ہی حکم نازل ہوتا رہتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہی ہر چیز پر قادر ہے۔

ہمارا پروردگار اتنی بڑی قوتوں اور کائنات کا مالک ہے مگر ہماری ذہنی پستی کا یہ عالم ہے کہ ہم اس کے کلام کو Decadent سمجھتے ہیں اور آج کے انسان کو زیادہ آگاہ اور باخبر سمجھتے ہیں۔ رب ذوالجلال نے اہل ایمان کے لیے جو جنت بنائی اسے باغ کہا۔ آج کا مفسر اسے عام باغ سمجھتا ہے' مگر اس کی وسعتوں کا یہ عالم ہے کہ حدیث نبویؐ میں ہے کہ جنت میں ایک گھر دوسرے سے 500 نوری سال کے فاصلے پر ہوگا اور ان کے درمیان مسافت براق سے طے کی جائے گی۔ اس کا حدود اربعہ قرآن حکیم نے یوں بیان کیا:

سابقواالی مغفرة من ربکم وجنة عرضها کعرض السماء و الارض (۲۱:۵۷)

ترجمہ: اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف سبقت لے جاؤ اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان وزمین کی سی وسعت ہے۔

یہ تو جنت کی وسعتیں ہیں۔ اس کائنات ارضی کی وسعتیں اتنی زیادہ ہیں کہ تاحال انسان اس قابل نہیں ہوا کہ دن کی پیمائش کر سکے۔ عصر حاضر کے جدید ترین محققوں نے جو زمین سے قریب کا ایک ستارہ دریافت کیا ہے' اس کا زمین سے فاصلہ 15 ٹریلین لائٹ ایئر ہے جبکہ اقطار السموات تو اس ستارے سے بھی کہیں آگے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے۔

یمعشرالجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السموات و الارض فانفذوا لاتنفذون الابسلطنO (۵۵:۳۳)

ترجمہ: اے گروہ جن وانس! اگر تم سے ہو سکے تو آسمان وزمین کی حدود سے نکل جاؤ۔ لیکن تم اس سے بلا سلطان (اللہ کی مدد) کے نہیں نکل سکتے۔

یعنی اقطار السموات و الارض سے گزرنے کی واحد سبیل صرف سلطان ہے اور پروردگار کے نزدیک سلطان وہ خود ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں 9 کروڑ سال کی تاریخ میں جو پہلا انسان تھا' اس سے ترقی کر کے جب وہ مہذب معاشرے کی سطح تک پہنچا تو فلسفہ عمرانیات وبشریات کا فیصلہ ہے کہ پہلا انسانی شعوری معاشرہ مذہبی معاشرہ ہے۔ یعنی سب سے پہلے انسان کو جو شعور عطا ہوا وہ مذہبی شعور تھا۔ قرآن حکیم انسان کے ارتقاء کے جملہ مراحل کو بیان کرتا ہے۔ کبھی انسان ناقابل تذکرہ شے بھی تھا:

ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیاء مذکورا (۷۶:۱)

ترجمہ: بے شک انسان پر زمانے میں ایسا وقت بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر

شے نہ تھا۔

یعنی محض ایک جرثومہ 'الجی' کائی یا کسی بھی شکل میں تھا۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آیا کہ اسے سنگل سیل سے ڈبل سیل کر دیا گیا اور اس مرحلے پر نر و مادہ کو ایک الگ کر دیا گیا۔

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج (۲:۷۶)

ترجمہ: بے شک ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔

یعنی یہاں پر ورد گار نے انسان کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا کہ اسے آزمائے کہ یہ شعور کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچتا ہے یا نہیں۔

نبتليه فجعلنه سميعا بصيرا (۲:۷۶)

ترجمہ: تا کہ ہم اسے آزمائیں۔ ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا ہے۔

یہ عمل جاری رہا۔ اسے سمیع و بصیر بنا دینے کے باوجود انسان کا ارتقاء تکمیل پذیر نہ ہوا تھا۔ انسان سوچتا سمجھتا نہ تھا۔ Anthropologist کہتے ہیں کہ انسان جانور سے جدا تب ہوا جب اس نے جبلی عادات کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔

ان هدينه السبيل اما شاكرا و اما كفورا (۳:۷۶)

ترجمہ: ہم ہی نے اسے راہ دکھا دی۔ خواہ وہ شکر گزار ہو یا نہ شکر گزار ہو۔

کہ ہم نے اسے عقل و شعور بخشا' مگر ابھی اس پر شناخت کا بوجھ نہیں ڈالا۔ ابھی صرف رہنمائی دی گئی' انسانی شعور نے سب سے پہلے پیغمبروں سے ہی روشنی حاصل کی۔ پہلا انسان پیغمبر ہی تھا۔ وہ انسان جو New Stone Age میں بستیاں بساتا نظر آتا ہے۔ اپنے تحفظ کی فکر کرتا نظر آتا ہے۔ جو اسباق سیکھتا اور آگے بڑھتا نظر آتا ہے۔ جسے آدم کہتے ہیں۔ وہی شناخت پر ورد گار کا حامل اور مظہر تھا۔ جو Last Iceage کے گم شدگان کی آخری یادگار ہے۔ اس طرح ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس کی Elimination کا عمل بھی جاری رہا۔ آج کا یہ ہدایت یافتہ انسان اب سے دس سے پچیس ہزار سال قبل کا انسان ہے۔ جب اس کی ارتقاء کی تشکیل تکمیل پذیر ہو گئی تو سزا و جزا کے قانون کی تشکیل بھی اس کے مطابق ہوئی۔ رب ذوالجلال نے انسان کے شعوری ارتقاء کے ساتھ ساتھ انہیں ہدایت ذ آگہی بخشی۔ اسے ایک قانون ملا۔ اس کے مطابق اس سے پرسش بھی ہو گی۔ اس طرح انسانی شعور بدلتا رہا' مگر شعور پر ورد گار مستقل رہا۔ جب انسان کا شعور مکمل ہو گیا تو رب ذوالجلال نے اپنے پیغام ہدایت کی بھی تکمیل کر دی۔

اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا(۵:۳)

ترجمہ: آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت مکمل کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا۔

کہ اب اللہ کا پیغام مکمل ہو گیا۔ یہ آخری اور محفوظ پیغام ہے۔ اس میں کسی ترمیم کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ قیامت تک کے علوم کا حامل ہے۔ اس کی ایک ایک آیت ناپ تول کر اتاری گئی ہے۔ اس طرح انسان کو امانت عقل و شعور دیا گیا اور یہ فیصلہ بھی کر دیا گیا کہ اگر انسان نے اس امانت کا تحفظ نہ کیا اور اس کی قدر نہ کی تو خلافت الہیہ کا اہل نہ رہے گا۔

آج کے دور تک پہنچتے ہوئے ہمارا سب سے بڑا احساس قرآن کی Decadent کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم اس امانت علمیہ کا حق نہیں ادا کر رہے۔ ہم اللہ پر' اس کی کتاب پر ایک مقلدانہ اور جابرانہ انداز سے سوچ رہے ہیں۔ ہم نے دہلیز غور و فکر کو پار نہیں کیا۔ ہم نے ان مسائل کو سمجھنے کے لیے امام بخاریؒ کی طرح ۳'۴ ہزار میل کا سفر نہیں کیا' کسی مشقت سے نہیں گزرے۔

قرآن سے عدم آگہی کی وجہ سے آج ہم دانشوران مغرب سے مرعوب ہیں۔ آج ہم اپنی صدیوں کو رسل' فرائیڈ' برگسان' نطشے اور وائٹ ہیڈ کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں مگر حقیقی دانش کی اور حقیقت کا کام ہے۔ اگر کسی نے خدا کی شناخت کا سفر طے نہیں کیا تو اس سے اپنی پہلی شعوری کاوش کا آغاز نہیں کیا' چاہے وہ Principia Mathematica لکھ دے' چاہے فلسفہ کی دنیا میں کہیں سے کہیں پہنچ جائے مگر وہ پروردگار عالم کی اس آیت کا مصداق ہے:

والذين كفروا اعمالهم كسراب بقيعة يحسبه الظمان ماءً حتى اذا جاء ہ لم يجده شياء ووجد الله عنده فوفه حسابه والله سريع الحساب (۳۹:۲۴)

ترجمہ: اور جو لوگ کافر ہیں۔ ان کے اعمال کی مثال بیابان میں سراب کی طرح ہے کہ پیاسا اس کو پانی سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچتا ہے تو کچھ نہیں پاتا اور اپنے پاس اللہ کو موجود پاتا ہے۔ بالآخر اللہ نے اس کا حساب پورا پورا چکا دیا اور اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم انہیں جہالت سے Discard کریں۔ ہر گز نہیں، ہم نے ان کے Ideas دیکھنے ہیں، فکر و فلسفہ دیکھنا ہے، مگر وہ ہمیں رہنمائی نہیں دے سکے۔ ہمیں رہنمائی عطا کر دی گئی ہے۔ دولت علم ہماری میراث ہے مگر احساس کمتری اور غلامی سے علم نہ سیکھا جا سکے گا۔

از غلاماں لذت قرآں مجو!
گرچہ باشی حافظ قرآں مجو

(اقبالؒ)

کہ جب ہم اغیار سے متاثر ہوں گے تو ان کے اثرات علم کے تحت تشکیک کے میدان سے گزرتے رہیں گے اور اپنے فکر و فلسفہ کی مضبوطی ہمیں میسر نہ آ سکے گی۔

اسلام کو کسی بھی نسل سے، کسی بھی عصر حاضر سے Sympathy کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہر زمانے میں غالب تھا۔ آج کے زمانے میں بھی غالب ہے۔ اگر ہم اس غلبے کی آرزو کریں تو اس میں کوئی اکیسویں صدی Matter نہیں کرتی، مگر جب ہم وہ بنیادی کام ترک کر دیتے ہیں جو صدیوں سے گزرنے کا چراغ ہے تو ہم اللہ کا حق ادا نہیں کرتے۔ اللہ نے ہمیں جو عقل و شعور عطا کیا وہ اپنے لیے عطا کیا ہے۔ خدا کے علم میں سارے علوم گم ہیں۔ جب اللہ کی جستجو کو چراغ بنایا جائے گا تو عصر حاضر سے آگے تھا۔ آداب احترام اور محض قرأت قرآن رسم و رواج کی حفاظت، اس کے ساتھ تدبر اور تفکر بھی ضروری ہے۔ بصورت دیگر قرآن کا موقف یہ ہے کہ:

ان شر الدواب عنداللہ الصم البکم الذین لایعقلون (۲۲:۸)

ترجمہ: بے شک سب جانوروں سے بدتر اللہ کے نزدیک وہی بہرے گونگے ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔

ہم اللہ کی تلاش کی راہ میں اپنے وسوسوں میں سے نہیں نکلے۔ اپنے حریف Ideas سے نہیں نکلے۔ قرآن کے خیال سے اپنے خیال کا موازنہ نہیں کرتے۔ ہم چھوٹی سی بیماری کے لیے لندن کے ماہر ڈاکٹروں سے رجوع کرتے ہیں، مگر قرآن کی فہم کے لیے ہمارا معیار کچھ اور ہے۔ ہماری عقل حسینؓ کے ساتھ ہے مگر عمل اپنی جبلت کے ساتھ یزید کے ساتھ ہے۔ آج کا زمانہ بھی ہم سے جہاد کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم صرف غم حسینؓ ہی کو نہ بیان کریں بلکہ عمل حسینؓ کی بھی تقلید کریں۔ اس کے لیے ہمیں دیکھنا ہو گا کہ حسینؓ نے عملاً اپنی

زندگی میں اپنی ترجیحات (Priorties) کا تعین کس طرح کیا۔ آپ نے لمحہ آخر میں بھی دو رکعت نماز کی اجازت چاہی کہ دنیا سے گزرتے ہوئے بھی آپ کو حق پروردگار کی ادائیگی کا فکر دامن گیر ہے۔ آج بھی اسلام حسینؓ کی جگہ پر ہے اور عصر جدید یزید کی جگہ پر۔ دجال عصر اپنے پورے زور پر ہے۔ جو اپنے آپ کو وقت کا خدا کہتا ہے۔ اپنی Philosophy of Liberty دیتا ہے۔ نام نہاد آزادی' جس نے تمام اخلاقی حدوں کو بھی پامال کر دیا ہے کو بت بنا دیا گیا ہے اور تعقل کی منفی تحقیق نے اس طلسم ہوش ربا میں انسان کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔

جبکہ دوسری طرف اگر اسلام کے مزاج کو دیکھا جائے تو تاریخ گواہ ہے کہ کسی بھی زمانے میں چاہے وہ عروج کا زمانہ ہو یا زوال کا مسلمانوں پر تعصب کا الزام نہیں لگا۔ کسی مسلمان کو غیر مسلموں نے متعصب نہیں کہا۔ Crusades کو دیکھیں۔ جبلت اور تعصب مغرب کی طرف سے سامنے آ رہا ہے۔ ایک انگریزی مصنف نے اپنے ناول Rabeca میں اپنی ہیروئن کی زبان سے کہلوایا کہ انگلینڈ سے نکل کر الجزائر نکل جاتے ہیں' کیونکہ مسلمان بڑے فراخ دل ہوتے ہیں۔ آج دنیا پر جو تعصب کی حکمرانی ہے یہ سوغات مسلمانوں نے نہیں' اسلام نے نہیں بلکہ خود مغرب نے دنیا کو دی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وحشت' دہشت گردی' قتل و غارت گری' یہ سب مغربی دنیا کے تحفے ہیں۔ نیویارک کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہر آدمی نادانستہ طور پر پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے۔ یہ ان کا Survival کا فوبیا ہے۔ باوجود حفاظتی بند باندھنے کے ساری قوم Distress کا شکار ہے۔ ان المیوں کا حل صرف اسلام دیتا ہے۔ عصر حاضر میں بھی anxiety' Depression کے لیے قرآن کہتا ہے:

من امن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحاً فلاخوف علیھم ولاھم یحزنون (۶۹:۵)

ترجمہ: جو اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرتا رہے اسے نہ خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔

کہ اگر میری طرف آؤ گے' اگر مجھ سے مانگو گے تو خوف اور حزن نہیں رہے گا۔

May Allah give us the honesty, knowledge-ability, the courage and the stability of mind.

اللہ ہمیں اپنے علم کے لیے فراغت عطا فرمائے۔ اپنا تجسس عطا کرے تاکہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زبانی ہم کہہ سکیں: قل رب زدنی علماO

اللھم انی اعوذبك من قلب لایخشع و علم لاینفع و دعاء لا یسمع

آج کوئی بھی عصر ایسا نہیں جو اللہ کی گرفت سے آزاد ہو۔ ہر عصر جدید میں رجعت اللہ ہی کی طرف ہے۔ ہر عصر کا مالک اللہ ہے۔ اسے ہمیں اپنے اوپر ایک خوف کے طور پر مسلط نہیں کرنا چاہیے۔ جب ہم اللہ کے ساتھ ہیں تو ہم زمانوں' علوم اور ترقی و عزت کے وارث ہیں۔ اور اگر اللہ سے جدا ہیں تو مسلمانوں کے لیے پسماندگی سے کوئی مفر نہیں۔ یہ اسلام ہی ہے کہ گیارہ سو برس تک غالب رہنے کے باوجود اس میں وہ تکبرات نہیں آئے وہ 100 سال کے عروج میں مغرب میں آچکے ہیں اور وہ کسی دوسرے کو زندہ رہنے کا حق بھی نہیں دے رہے۔ اس کردار کے حامل یورپ کے 100 برس کے عروج سے ہم کیوں مغلوب ہوں گے؟ ایسا تصور دراصل جہالت علمیہ اور تجسس کی کمی کی وجہ سے ہے۔ صاف ستھری کاوشوں کا فقدان اور محنت و عمل سے گریز کی وجہ سے ہے۔

اللہ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم امت کے فرد کے احساس سے اللہ کی بندگی کے احساس سے جئیں کہ اللہ کو علم سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔ ہم اس کی شناخت کی طرف بڑھیں کہ ہمیں زمین و آسمان کی سیادت عطا ہو اور بارگاہ الوہیت سے یہ مژدہ عطا ہو:

ولاتھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنینO

وماعلینا الاالبلاغ O

کشت زربار
پروفیسر احمد رفیق اختر